rekhta BOOKS شمارہ نمبر:006:آج

ترتیب : اجمل کمال

افربام یہوشوا صلاح الدین محمود
فہمیدہ ریاض نیّر مسعود
یانس رتسوس انطون شمّاس
اسما راجا ولاس سارنگ

آج کی کتابیں

1
154

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

سرما ۱۹۹۱

آج

ترتیب: اجمل کمال

آج

دسمبر ۱۹۹۰

مینیجنگ ایڈیٹر، پبلشر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۳۶

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۸ دارلامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ابنِ حسن پرنٹنگ پریس
ہاکی اسٹیڈیم کراچی

تقسیم کار
مکتبۂ دانیال
وکٹوریہ چیمبرز نمبر ۲ عبداللہ ہارون روڈ کراچی

کلاسیک
شاہراہ قائداعظم لاہور

Scanned with CamScanner

ترتیب

۸

افریام پیوشوا

منہر سکوت

۳۶

صلاح الدین محمود

بم ابھی ابھی
غیب کا عنقا پانی
میں نظم

۵۲

فہمیدہ ریاض

مردمک چشم میں
ناشکیبائی نہیں

۵۵

نیر مسعود

سلطان مظفر کا واقعہ نویس

یانس رتسوس

پس خوردہ صبح جادوگر
تیسرا تیوا مدرا اپنے شغل میں تنہا
تقریباً سپردگی ایک بیمار آدمی کا دن
اجنبی خطوں میں احساس کی پرتیں رشتہ
نجات کا راستا کوزہ گر ضروریات احتیاط
پانیریس کے قیدیوں کا ٹرانسپورٹ سیکشن
منظر سزائے موت کا منتظر مشکوک
وہی رات تلاشی نیند سے پہلے
چہرہ یا مجسمہ یاد دستک
ایک بوڑھا مچھیرا

۹۰

انطون شمّاس

عربی، عبرانی اور قصّہ گو کی قمیص

۱۰۶

اسما راجا

نظم نظم
بوموفوبیا
ایک محبت

Scanned with CamScanner

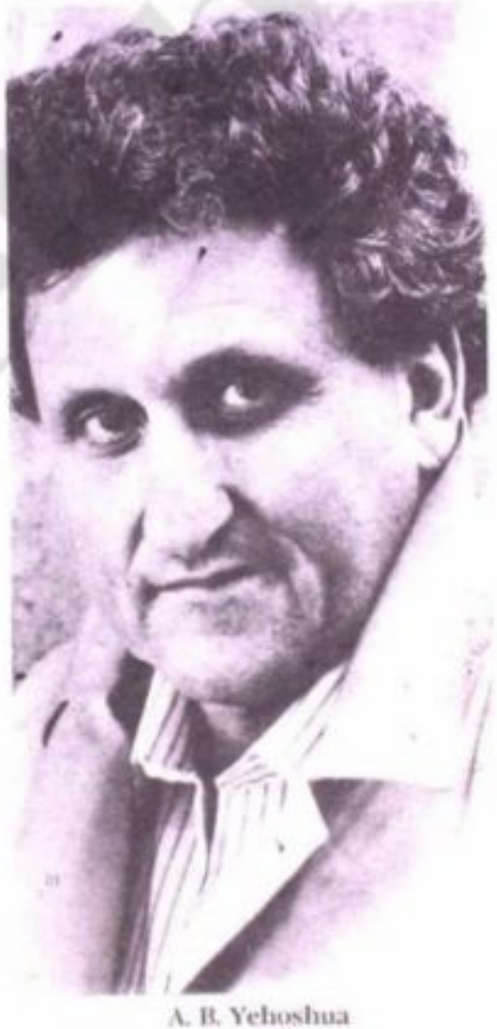

A. B. Yehoshua

وِلاس سارنگ

واپسی — نکھل کے خطوط

تاریخ ہمارے ساتھ ہے

خرگوش

Scanned with CamScanner

افریام یہوشوا

افریام یہوشوا (اے بی یہوشوا) عبرانی زبان کے جدید فکشن کے اہم ترین نمائندوں میں سے ایک ہیں۔ ان کے ناولوں اور کہانیوں کو کہانی کہنے کے فن پر ان کی بے پناہ گرفت اور انسانی نفسیات کے گہرے ادراک کے باعث مغربی قارئین اور نقادوں کی متفقہ تحسین حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہوشوا کی کہانیاں محض کرداروں کے نفسیاتی مطالعے سے کہیں بڑھ کر ہیں۔ ان کے یہاں روزمرہ زندگی کی تفصیلوں کا فنکارانہ استعمال، لفظوں کا محتاط اور حساس انتخاب، اور جملوں کی ساخت کا شاعرانہ پن ان کہانیوں کو پڑھنے والے کے لیے ایک بھرپور جمالیاتی تجربے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

یہوشوا کی کہانی *The Continuing Silence of a Poet* کا ترجمہ اس شمارے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ وہ ۱۹۸۸ میں اسی نام سے شائع ہونے والے مجموعے کی پہلی کہانی ہے۔ یہوشوا کی کسی تحریر کا اردو میں غالباً اس سے پہلے ترجمہ نہیں ہوا۔

یہوشوا حیفہ یونیورسٹی میں ادبیات کے استاد ہیں۔ ان کے کئی ناول اور کہانیوں کے مجموعے انگریزی زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔

افریام یہوشوا

مہرِ سکوت

کل وہ پھر رات گئے لوٹا اور میری نیند کا خیال کیے بغیر کھٹ پٹ کرتا اندر داخل ہوا۔ خالی مکان اس کے قدموں کی آہٹ سے گونجتا رہا۔ ہال کی بتّیاں روشن کیے، وہ دیر تک کاغذات الٹ پلٹ کرتا رہا۔ لگتا تھا یہ ہنگامہ کبھی ختم نہ ہو گا۔ بالآخر خاموشی چھا گئی اور میں بڑھاپے کی کجّی اور مبہم نیند میں لوٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر یہ بارش۔ تین ہفتے ہو چکے ہیں اس بارش کو برستے ہوئے۔ پانی کی برستی ہوئی چادریں کھڑکی سے مسلسل رگڑ کھاتی رہتی ہیں۔

وہ رات کو کہاں جاتا ہے؟ معلوم نہیں۔ ایک دفعہ میں نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ لیکن ایک پرانا واقف کار -- ایک لاعلاج قسم کا نثرنگار -- گلی کے نکڑ پر ٹکرا گیااور اس نے مجھے دیر تک اٹکائے رکھا۔ لڑکا اس اثنا میں گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو چکا تھا۔

بارشیں اس میدان کو کولتار، ریت اور پانی کی دلدل میں تبدیل کرتی جا رہی ہیں۔ سردیوں میں تل ابیب، شہر جس میں پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں، کوئی راستا نہیں۔ جگ جگ جھیلیں ابھر آئی ہیں۔ اور دور گندا، مٹیالا، گرجتا ہوا سمندر، بڑھتے ہوئے شہر سے پسپائی اختیار کرتا ہوا، صرف ایک پس منظر میں بدل گیا ہے۔

ابھی شام کے پانچ بھی نہیں بجے اور کھڑکیاں سرمئی دھند میں ڈوب چلی ہیں۔ وہ کیا تھا؟ واہمہ؟ خواب؟ ساحل سے کچھ فاصلے پر، وہ میری نظروں کے عین سامنے کھڑا تھا۔ اس کا سراپا بالکل واضح تھا۔ میرا خیال ہے اس کی آغوش میں سیاہ پرندے تھے، جن کی پھڑپھڑاہٹ کو وہ نرم ہاتھوں سے دبانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر میں حیران تھا۔ اس نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور دھیمے سے مسکرایا۔

دوسرے کمرے سے اس کے خرّاٹوں کی آواز آ رہی ہے۔ اور میں جانتا ہوں اب مجھے نیند

rekhta
rekhta
Scanned with CamScanner

اس پر سوار ہو جاؤں گا۔ اور پھر یہ درد زائل ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے صرف اس لمحے تک اپنا وقار، اپنا ضبط برقرار رکھنا ہے۔ صرف بیس گھنٹے اور۔

گو کہ وہ اس وقت میری نظروں کے سامنے نہیں ہے، لیکن مجھے معلوم ہے وہ سو رہا ہے۔ دل پر ہاتھ، بند آنکھیں، کھلا دہانہ، ہموار سانسیں۔

پہلے میں بتاتا چلوں کہ وہ دیکھنے میں کیسا ہے۔ میں اس کا نقشہ کھینچ سکتا ہوں۔ کیونکہ گو وہ ابھی سترہ برس کا نہیں ہوا، اس کے نقوش میں ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ کافی عرصہ پہلے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے خط و خال ساکن ہو گئے ہیں۔ جیسے ان میں اب کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ وہ اب کبھی نہ بدلے گا۔

اس کے خفیف سے ڈھلکے ہوئے کندھے، عجز سے آگے کو جھکا ہوا خشم آلود جسم، سیاہ سر۔ اس کا چہرہ ؛ کھردرا، موٹا، بھدا رخسار اور پیشانی پر نکلتے ہوئے مہاسے، ڈاڑھی کی آمد کا پتا دیتی ہوئی سیاہ روئیدگی، چھوٹے، گھٹے ہوئے بال۔ اور اس کی عینک۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے -- بلکہ میں پہلے ہی سے یہ اعلان کیے دیتا ہوں -- کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ غبی ہے، کند ذہن ہے۔ یہ اس کے بارے میں عام رائے ہے، اور میری بیٹیاں اس سے متفق ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہوں کیونکہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے میرے بارے میں انکشاف ہوتا ہو، یا میرے حواس کی صحت پر کوئی شک پیدا ہوتا ہو۔ میں نے اس موضوع پر کافی سائنسی مواد پڑھا ہے، اور میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ محض ایک حادثہ ہے۔ اور پھر وہ مجھ سے قطعی مشابہت نہیں رکھتا۔ سوائے ایک خاص وحشی پن کے، ہم دونوں میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ لہٰذا مجھے کوئی خوف نہیں۔ اور مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ وہ ایک بورڈرلائن کیس ہے۔ وہ خرد و جنوں کی مبہم سرحد پر منڈلا رہا ہے۔ ثبوت؟ اس کی آنکھیں۔ میں وہ واحد شخص ہوں جسے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے کئی مواقع پیش آئے ہیں، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کی آنکھوں میں کبھی کبھی (شاذ و نادر، مجھے اقرار ہے) ایک الاؤ سا روشن ہو جاتا ہے۔ اور اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک ایک پُرتاثیر چمک، ایک گمبھیر قوت سی لپک جاتی ہے۔

اور، صرف اس کی آنکھیں ہی نہیں۔

مگر اس کے باوجود...

وہ میری زندگی میں بڑی دیر بعد پیدا ہوا۔ حادثاتی طور پر، غلطی سے، کسی ملعون معجزے کے تحت۔ کیونکہ ہم دونوں -- میں اور اس کی ماں -- اس وقت بڑھاپے کی دہلیز پر تھے۔

وہ وقت مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس کی پیدائش سے پہلے کا وقت۔ وہ ایک نرم و نازک سی بہار تھی، طویل، مسحورکن بہار۔ اور میں ایک شاعر، جس کے پانچ مجموعے چھپ چکے تھے، اور جس نے کبھی نظمیں نہ کہنے کا عہد کر لیا تھا۔ ایک قطعی فیصلہ۔ یقین کامل کے ساتھ۔ گہری مایوسی میں کیا گیا ایک اٹل فیصلہ۔ یہ میری زندگی کی وہ بہار تھی جب میں نے اپنے آپ

سے اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ اب مجھے خاموش ہو جانا چاہیے۔

میں دُھن بھول چکا تھا۔

میرے قریب ترین دوستوں نے پہلے ہی مجھے طعنے دینے شروع کر دیے تھے۔ میری ہمتیں پست کر دی تھیں۔ میں جو نظم کہتا وہ رد کر دیتے۔ نوجوان شاعروں اور ان کی جدید شاعری نے مجھے پریشان کر دیا تھا، پاگل بنا دیا تھا۔ میں نے چوری چھپے ان کی نقل کرنے کی کوشش کی اور بدترین نظمیں کہیں۔ "ٹھیک ہے"، میں نے خود سے کہا، "میں اب خاموش ہو جاتا ہوں..." اور پھر کیا ہوا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے روزمرّہ کے معمولات میں فرق آ گیا۔ کبھی ہم سرِشام ہی سونے کے لیے لیٹ جاتے، اور کبھی پُربجوم کیفوں میں رات گئے بیٹھے رہتے؛ فضول تقریریں، بےمعنی بحثیں؛ یا پھر عمررسیدہ فنکاروں کے ساتھ شامیں مناتے، فنکار جو عزت اور شہرت کی آس لگائے موت کی دہلیز پر بیٹھے تھے۔

وہ طویل، خوشگوار بہار، وہ سبک ہوائیں، وہ کھلے ہوئے غنچے۔ اور میں سڑکوں پر آوارہ پھرتا، بےچینی روح کی طرح بھٹکتا۔ نشے میں دُھت ہونے کی کوشش کرتا، اور سب کے سامنے اپنے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانے کے عہد کو دہراتا۔ شاعری کو برا بھلا کہتا، کہتا اب تو مشینوں کے ذریعے نظمیں تیار کرنے کا زمانہ آ گیا ہے، پُرتضحیک لہجے میں دیر تک ہنستا، اور اپنی کمزوریوں کا اعتراف کرتا۔ اور رات میں اخبارات کے مدیروں کو پبلک ٹرانسپورٹ جیسے غیراہم موضوعات پر خط لکھا کرتا، الفاظ کے موتی پُنھاتا، جملوں کو سجاتا بناتا۔

اور پھر اچانک یہ غیرمتوقع حمل۔

شرمناک بات۔

گرمی کے اوائل میں ہمیں اس کا پتا چلا۔ پہلے کافی دن تو ہم نے شام ڈھلے تک چہل قدمی کر کر کے گزارے۔ پھر خود کو گھر میں قید کر لیا۔ اور پھر اس بات پر شرمندہ ہونے لگے۔ پہلے ہم نے اپنی بیٹیوں سے معذرت چاہی جو اپنی عمررسیدہ ماں کے بڑھتے ہوئے پیٹ کی طرف خوف سے دیکھتیں۔ اور پھر رشتےداروں سے، جو نظریں نیچی کیے نوزائیدہ بچے کو دیکھنے آئے۔

(اس کی پیدائش وسط سرما میں ایک منجمد کر دینے والے دن وقوع پذیر ہوئی۔ باغ کی گھاس برف سے ڈھکی ہوئی تھی۔)

اب ہم بچے کے ساتھ قید ہو گئے۔ (لڑکیاں بچے کا ایک کام نہ کرتیں اور جان بوجھ کر زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتیں۔) ہم دونوں ایک دوسرے سے بات کرنا چاہتے تھے، ایک دوسرے سے کہنا چاہتے تھے کہ "دیکھو، یہ کتنی خوشگوار بات ہوئی ہے۔ یہ بچے کی پیدائش..." لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے دل اس میں نہ تھے۔ اور پھر دوبارہ وہی معمول ؛ نیند اور نشے میں چور، رات گئے گھر آنا۔ گھر کی دیواروں پر چنار کے لپٹتے ہوئے سائے، اور کمرور میں بندھی الگنیوں پر لٹکے ہوئے گیلے اور بھاری پوتڑے؛ کتنا پژمردہ کر دینے والا ماحول تھا۔ ہم جی رہے تھے یا جیسے خود کو پیروں پر گھسیٹ رہے تھے۔

آہستہ آہستہ بچہ بڑا ہونا شروع ہوا، نشوونما کے ہر مرحلے میں سست۔ وہ میرے بستر کے ساتھ لگے جھولے میں بےحس پڑا رہتا۔ جب میں وہ دن یاد کرتا ہوں تو اس کی سرمئی

Scanned with CamScanner

پہلی دفعہ اس وقت شک ہوا جب وہ تیں سال کا ہونے کو تھا۔ پہلے پہل لڑکیوں نے اس موضوع کو اٹھایا، میں نے نہیں۔ اس کی جسمانی حرکات سست تھیں، وہ بری طرح ہکلاتا تھا، لہٰذا میری بیٹیوں نے اسے ذہنی پس ماندہ قرار دیا۔ دوست احباب آتے، اس کو دیکھتے اور اس میں ان نشانیوں کو تلاش کرتے تاکہ اس بات کی تصدیق کر سکیں جو آج تک ہمارے منہ سے نہ نکل پائی تھی۔

مجھے اس کی زندگی کا وہ حصہ اچھی طرح یاد نہیں۔ میں اس تمام عرصے میں اس کی ماں کی بیماری میں الجھا رہا۔ وہ تیزی سے گھلتی جا رہی تھی۔ بچے کی پیدائش کے بعد اب اس میں جان باقی نہ رہی تھی، صرف کھوکھلا خول رہ گیا تھا۔ وہ ہم سے دور صحرا میں اتر جاتی، ویران، بنجر ٹیلوں میں بھٹکتی اور افق کی دھند میں گم ہو جاتی، اور ہم بےبسی سے دیکھتے رہنے کے سوا کچھ نہ کر سکتے تھے۔

ہر دن اس پر تبدیلی کا نشان چھوڑ جاتا۔

بچہ چھ برس کا تھا جب اس کی ماں کا انتقال ہوا۔ بھاری، ڈھل مل سا بچہ۔ وہ گھر میں کسی سے مانوس نہ ہوا تھا، اپنی ذات میں سمٹ کر رہ گیا تھا، لیکن وہ کبھی خوابوں کی دنیا میں گم نہیں رہتا تھا، وہ خوابوں میں رہنے والا بچہ تھا ہی نہیں۔ مضطرب اور بے چین، وہ ہر وقت تناؤ کا شکار رہتا۔ جب کبھی میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا تو وہ کانپنے لگتا۔

کاش میں اس پر ترس کھاکر کہہ سکتا، یتیم بچہ۔ لیکن یہ لفظ میرے حلق میں اٹک سا جاتا ہے۔ ماں کی موت نے اس پر کسی قسم کا تاثر نہ چھوڑا، گو کہ میری بوکھلاہٹ کی وجہ سے وہ جنازے میں ہمارے پیچھے پیچھے گھسٹتا چلا آیا تھا۔ اس نے کبھی اپنی ماں کے بارے میں نہ پوچھا، گویا اسے علم تھا کہ اب وہ کبھی واپس نہ آئے گی۔ موت کے چند ماہ بعد اس کی تمام تصویریں گھر سے غائب ہو گئیں۔ اور جب کچھ دنوں کے بعد ہمیں اس کا احساس ہوا تو ہمارے ذہنوں میں کہیں سے یہ خیال نہ آیا کہ اس سے بھی پوچھا جا سکتا ہے۔ جب بالآخر ہم نے اس سے گمشدہ تصویروں کے بارے میں پوچھا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ شام کا اندھیرا ہو چلا تھا جب اس نے ہمیں دفینے کی جگہ دکھائی، باغ کے آخری کونے میں، چنار کے درخت کے نیچے، بوسیدہ، کسی قدیم وقت کے گڑھے کے نشانوں کے درمیان، ایک چیتھڑے میں لپٹی ہوئی، کئی بھٹی تصویریں۔

وہ دیر تک ہمارے سامنے کھڑا، شدّت جذبات سے اک بگولا سا بنا، بکلا بکلا کر کچھ کہتا رہا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اضطراب سے گھوم رہی تھیں۔

زندگی میں پہلی دفعہ ہماری آنکھیں کھلیں۔ ہمارے سامنے ایک ننھا منا، جیتا جاگتا انسان تھا۔

میں اپنے آپ پر قابو نہ پا سکا، اور اس کو خوب مارا، زندگی میں پہلی بار۔ میں نے اس کی کلائی پکڑی اور اس کا رخسار پر زور زور سے چاٹنے لگائے۔ اور پھر میری بیٹیوں نے بھی

اس کی پٹائی کی۔ (لڑکیوں نے اسے کیوں مارا؟)

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا...

وہ حیرت زدہ سا ہمیں دیکھتا رہا، اور پھر زمین پر گر کر مٹی میں لوٹنے لگا، اور خوب رویا۔ ہم نے اسے گھسیٹ کر کھڑا کیا اور گھر کے اندر لے آئے۔

اس سے پہلے مجھے کبھی احساس تک نہ ہوا تھا کہ وہ گھر کے چپے چپے سے اس حد تک واقف ہو گا، ہر کونے کھدرے کا اسے علم ہو گا۔ اس نے اپنی ماں کی تصویریں بوسیدہ البموں سے نکالی تھیں، پرانے لفافوں کی تلاشی لی تھی، اور اسے باغ کے اس خفیہ گوشے کا بھی علم تھا جس سے میں آج تک لاعلم رہا۔ ہم اس گھر میں برسوں سے رہ رہے تھے، اور میں نے کتنی ہی بےقرار راتیں باغ میں ٹہل ٹہل کر گزاری تھیں، لیکن مجھے آج تک چونے کے اس پرانے گڑھے کا نشان تک نظر نہ آیا تھا جو سرمئی کائی سے ڈھکا ہوا تھا۔

کیا وہ ابتدائی علامتیں تھیں؟ مجھے نہیں معلوم۔ نہ میں، اور نہ میری بیٹیاں اس وقت یہ بات سمجھنے کے لیے تیار تھیں۔ ہمیں صرف اس کی وجہ سے پیش آنے والی رسوائی کا خوف تھا۔ اس کو لوگوں کی نظروں سے چھپانا ناممکن تھا، لیکن کم از کم ہم اس کی حفاظت تو کرنا چاہتے تھے۔

اس وقت تک، دراصل، میری بیٹیوں کی شادی نہیں ہوئی تھی...

ستمبر میں میں نے اس کو شہر کے مضافات میں ایک اسکول کی پہلی جماعت میں داخل کرا دیا۔ ہفتہ بھر میں دفتر سے جلد اٹھتا رہا۔ میں چھٹی ہونے سے پہلے اسکول کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر اس کا انتظار کرتا۔ مجھے خطرہ تھا کہ بچے اس کا مذاق اڑائیں گے۔

دوپہر میں وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیے، ستمبر کے جھلسا دینے والے آسمان کے نیچے میرے ساتھ ساتھ چلتا۔ بستا اس کی پیٹھ پر جھول رہا ہوتا، ٹوپی اس کے ماتھے پہ اتری ہوئی ہوتی، ہونٹ نیم وا ہوتے۔ اس کی سانسوں کی مدّھم آواز۔ اور اپنی داخلی بصیرت کے زاویے کو تبدیل کیے بغیر، عدم معروضیت سے، دنیا کا جائزہ لیتی ہوئی اس کی وہ شفاف نگاہیں۔

واقف کار اپنے ہیٹ اتار کر ہلاتے، میرے پاس آتے، مجھ سے ہاتھ ملاتے، جھک کر اس کا ننّھا سا ہاتھ تھام کر نرمی سے دباتے، مسکرانے کی کوشش کرتے۔ اس کی اوپر اٹھی ہوئی، خالی، بےرونق نگاہیں ان کو منجمد کر دیتیں۔ احمق، بالکل احمق، ضعیف العقل۔

ایک ہفتے بعد میں نے اس کو خود سے گھر پہنچنے دیا۔ میرا خوف بےجا تھا۔ بچوں کو اسے اپنے گروہوں سے دور رکھنے کی زحمت ہی نہیں اٹھانی پڑی۔ وہ تھا ہی الگ تھلگ، تنہا۔

اس سال میری لڑکیوں کی شادیاں ہو گئیں۔ دونوں کی ایک ہی دن، جیسے کسی عجلت میں۔ گویا کسی مجبوری کے تحت وہ گھر سے فرار ہونے پر تلی بیٹھی ہوں۔ وہ دونوں اس وقت کتنی کم عمر تھیں۔

وہ سال کیسی کشمکش میں گزرا۔ کوئی ہفتہ نہ جاتا تھا کہ گھر میں طرب و نشاط کی محفل نہ ہو۔ آنکھوں میں آنسو لیے، لڑکیاں مجھ سے تقاضا کرتیں کہ میں اسے مہمانوں سے

Scanned with CamScanner

جاتا، اور ہم دونوں گلیوں میں، میدانوں میں بھٹکتے، ساحل کے کنارے کنارے چلتے۔

ہم دونوں خاموش رہتے۔ ڈوبتے سورج اور شام کے پہلے ستاروں کو ابھرتا ہوا دیکھتے۔ بلک، میں دیکھتا اور وہ میرے ساتھ کھڑا ہوتا، ساکت، زمیں پر نظریں گاڑے۔ لیکن پھر برسات شروع ہو گئی، میدان کیچڑ میں تبدیل ہو گئے اور ہم دونوں گھر کے اندر قید ہو کر رہ گئے۔ لڑکیوں سے شادی کے طلب گار دو نوجوان ہماری زندگی میں داخل ہو گئے تھے۔ پھر ان کے دوست، اور ان کے دوستوں کے دوست۔ گھر قہقہوں اور دھویں سے بھرا رہتا۔ شروع میں ہم نے اس کو ملازمہ کے کمرے میں چھپانے کی کوشش کی، لیکن جب اس کو وہاں نیند نہ آتی تو ہم خاموشی سے اس کو باورچی خانے میں پہنچا دیتے۔ وہ شب خوابی کے لباس میں بیٹھا رہتا اور لوگوں کو آتے جاتے دیکھا کرتا۔ اور پھر اٹھ کر برتن دھونے لگتا۔ پہلے تو اس نے صرف چمچے دھوئے، لیکن پھر ان لوگوں نے اس سے چھریاں بھی دھلوانا شروع کر دیں۔

آہستہ آہستہ اس کو ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی، جہاں یہ سارا ہنگامہ بپا ہوتا۔ شروع شروع میں وہ مہمانوں کو بسکٹ اور مٹھائی پیش کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ جام انڈیلنے اور سگریٹ سلگانے کی پیشکش کرنے لگا۔ ابتدا میں لوگ اس کو دیکھ کر سمت سے جاتے۔ کمرے میں اچانک خاموشی چھا جاتی، ایک مبہم سا خوف طاری ہو جاتا۔ ایک بیٹی کا منگیتر غصے میں اٹھ کر کھڑکی سے باہر اندھیرے میں تکنے لگتا۔ کمرے میں کوئی آواز سنائی نہ دیتی، جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ صرف بچے کی تیز، مضطرب سانسیں خاموشی کو چیرا کرتیں، اور وہ ایک درد بھری سنجیدگی کے ساتھ باتھوں میں ٹرے تھامے ایک مہمان سے دوسرے مہمان کے پاس جاتا۔ کوئی اس کے ہاتھ سے بسکٹ یا مٹھائی لینے سے انکار نہ کرتا۔

آہستہ آہستہ لوگوں کو اس کی عادت ہو گئی۔ لڑکیوں کے دل پگھل گئے، اور وہ مہمانوں کے سامنے اس کی موجودگی کو برداشت کرنے لگیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی خدمات روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ اور شام ڈھلے جب مہمان تھک سے جاتے، اس کے چہرے پر ایک نئی دمک آ جاتی۔ کوئی مہمان، نشے میں مخمور، اس میں اچانک دلچسپی کا اظہار کرتا۔ اس کو اپنے قریب کھینچ کر بٹھا لیتا، اور دیر تک اس سے باتیں کرتا۔ بچہ اس کے بازوؤں میں گھبراہٹ اور تناؤ سے لکڑی کی طرح اینٹھ جاتا، اس کی آنکھیں ویران ہو جاتیں۔ پھر وہ اٹھ کر راکھ دان خالی کرنے لگتا۔

ان گرمیوں کے آخر میں ہم دونوں گھر میں تنہا رہ گئے۔

اگست کے وسط کی ایک سہ پہر لڑکیوں کی شادی ہو گئی۔ نیلے آسمان تلے ہمارے باغ میں ایک بڑا سا چھتر لگا۔ مہمانوں کے قدموں کے نیچے کٹی ہوئی گھاس سرسرا رہی تھی۔ جذبات کی شدت سے میری سانس رکنے لگی تھی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ پُرنم آنکھوں اور رُندھے ہوئے گلے کے ساتھ میں ہر ایک کو سینے سے لگاتا پھر رہا تھا، بوسے دے رہا تھا۔ بچہ شادی کی تقریب میں موجود نہ تھا۔ غالباً دولہا والوں میں سے کسی نے اس بات کی

مہمان مجھ سے گلے ملنے کے بعد رخصت ہو رہے تھے تو اچانک میری نظر اس پر پڑی۔ وہ ایک لمبی میز کے قریب بیٹھا تھا۔ روزمرہ کے کپڑوں میں ملبوس، سوائے ایک سرخ ٹائی کے جو کسی نے اس کے گلے میں لٹکا دی تھی۔ کیک کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کے ہاتھوں میں تھما دیا گیا تھا۔ سنا ہوا میز پوش سرک کر اس کے گھٹنوں تک آ پہنچا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ منہ چلا رہا تھا، اور اس کی نظریں چنار کی شاخوں میں الجھے ہوئے زرد چاند پر منجمد تھیں۔

میں اس کے قریب گیا اور آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

گھبراہٹ میں اس کے ہاتھوں سے کیک کا ٹکڑا چھوٹ گیا۔

میں نے کہا، "چاند! کتنا خوبصورت چاند ہے۔۔۔"

اس نے نگاہیں اٹھا کر چاند کی طرف یوں دیکھا جیسے زندگی میں پہلی بار چاند دیکھ رہا ہو۔

اور پھر ہم دونوں کی ایک دوسرے کی رفاقت میں زندگی کا آغاز ہوا۔ اس لمحے، اس ویران، خاموش گھر میں، بکھری ہوئی خوشبوؤں کی شیشیوں اور رومالوں کے سرسراتے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان۔ میں ایک شاعر، جس کے لبوں پر مہر ثبت ہو چکی تھی، اور وہ ایک ضعیف العقل، تنہا، بچہ۔

کیونکہ یہ اس کی تنہائی ہی تھی جس کے ساتھ اس نے میرا سامنا کیا۔

یہ بات میں اب سمجھ پایا ہوں۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ اسکول میں بالکل تنہا تھا۔ پہلے ہی ہفتے میں اس نے کلاس روم کی آخری بنچ میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔ کلاس سے الگ تھلگ، وہ ہمیشہ کونے میں خاموش بیٹھا رہتا۔ استاد پہلے ہی اس کو لاعلاج قرار دے چکے تھے۔

اس کی تمام رپورٹوں میں درج ہوتا، "جانچ ممکن نہیں"، اور صفحے کے کونے پر استاد کی جھجھکتے ہوئی تحریر میں گھسیٹا ہوا دستخط ہوتا۔ مجھے آج تک حیرت ہے کہ وہ لوگ اسے ایک جماعت سے دوسری جماعت میں کیسے چڑھاتے رہے۔ کبھی کبھار وہ ایک ہی جماعت میں دو تین سال گزار دیتا، لیکن آخرکار اگلی جماعت میں پہنچ ہی جاتا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھ پر عنایت کر رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے ان میں کچھ استاد ایسے ہوں جنھیں میری پرانی نظمیں پسند ہوں۔

میں ان کا سامنا کرنے سے عموماً کتراتا۔

ان کی بھی پوری کوشش ہوتی کہ مجھ سے نظریں نہ ملنے پائیں۔

میں انھیں کوئی الزام نہیں دیتا۔

اگر ہمیں زبردستی ملنا ہی پڑتا، مثلاً یوم والدین کے موقع پر، تو میں ہمیشہ دیر سے اور سب سے آخر میں پہنچتا۔ اس وقت اسکول کی عمارت اندھیرے میں ڈوب چکی ہوتی، اور اندر ننگے بلبوں سے روشن خالی کمروں کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں تھکی سے چور استاد نیم

Scanned with CamScanner

دراز ہوتے۔

تب مَیں بیت ہاتھ میں دبائے، چور کی طرح دروازے میں داخل ہوتا۔ اگر وہاں اس وقت کوئی نوجوان ماں باپ بیٹھے ہوتے، تو میری سفید چوٹی دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے۔ (میں نے اب تک چوٹی رکھی ہوئی تھی۔) استاد مجھے دیکھ کر مریل سا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے اور ایک کمزور سی مسکراہٹ چہرے پر لاتے۔

میں بیٹھ جاتا اور ان کا سامنا کرتا۔

وہ مجھے کیا بتا سکتے تھے جو میں پہلے ہی سے نہ جانتا تھا؟

کبھی وہ بھول جاتے کہ میں کون ہوں۔

"جی جناب؟ آپ کس بچے کے والد ہیں؟"

اور میں اس کا نام لیتا۔ میرے سینے میں اچانک ایک ٹیس سی اٹھتی۔

وہ اپنے کاغذات الٹتے، اس کی خالی رپورٹ نکالتے۔ آنکھیں بند کر کے اپنا سر ہاتھوں میں تھام لیتے اور مجھ سے سخت لہجے میں سوال کرتے؛ "کب تک؟"

ان کا مطلب ہوتا کہ آخر وہ اسے کب تک اسکول میں رکھیں؟

میں خاموش رہتا۔

انھیں غصہ آ جاتا۔ شاید باہر پھیلتا ہوا اندھیرا ان کی بےصبری میں اضافہ کر دیتا۔ وہ اصرار کرتے کہ میں اسے اسکول سے اٹھا لوں۔ اب وہ مزید یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتے۔ اٹھا کر کہاں لے جاؤں؟ انھیں نہیں معلوم ۔ کہیں اور... شاید کوئی ادارہ اسے لے سکے۔

لیکن رفتہ رفتہ ان کے طیش میں کمی آ جاتی۔ وہ اقرار کرتے کہ وہ خطرناک نہیں ہے۔ بےضرر ہے۔ کلاس میں کسی کو پریشان نہیں کرتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ کلاس میں بالکل خاموشی سے بیٹھتا ہے اور توجّہ سے استاد کی ہر بات سنتا ہے۔ بلکہ وہ ہوم ورک بھی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

میرے ہاتھوں میں بیت چرمرا کر ادھ موا ہو چکا ہوتا ہے۔ میں کن انکھیوں سے کلاس روم کی طرف دیکھتا ہوں۔ چھنکوں، پھٹے کاغذوں، اور چھلی ہوئی پنسلوں کے ٹکڑوں سے اٹا فرش، تختۂ سیاہ پر پاگلوں کے بنائے ہوئے گل بوٹے اور تصویریں۔ آنسوؤں کے ننھے ننھے قطرے میری آنکھوں میں چُبھنے لگتے ہیں۔ میں ان سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بچے کی مدد کروں گا۔ ہر شام اس کو پڑھاؤں گا۔ کیونکہ ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ کیونکہ بچہ آخر بورڈرلائن کیس ہی تو ہے۔

لیکن ہر شام گھر میں مجھ پر یاسیت چھا جاتی ہے۔ میں گھنٹوں کتابیں کھول کر اس کے ساتھ بیٹھا رہتا ہوں اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ وہ میرے قریب جنبش کیے بغیر، اکڑا بیٹھا رہتا ہے۔ میرے منھ سے نکلے الفاظ پانی میں مٹی کے تیل کی طرح تیرتے ہیں۔ آخر کار جب میں اس کو اٹھنے دیتا ہوں، وہ اپنے کمرے میں جا کر آدھ گھنٹا خود سے ہوم ورک کرنے میں گزار دیتا ہے۔ پھر وہ اپنی کتابیں بند کر کے بستے میں رکھ دیتا ہے۔

کبھی کبھی صبح کے وقت، جب وہ سو رہا ہوتا ہے، میں بستہ کھول کر اس کی کاپیاں دیکھتا ہوں۔ اس کے جوابات مجھے حواس باختہ کر دیتے ہیں ؛ عقل سے بعید خیالات۔ حساب کی کاپی دیکھ کر میں بھونچکا رہ جاتا ہوں ؛ جوش و خروش سے لکھے ہوئے عجیب وغریب اور غیرمنطقی اعداد۔

لیکن میں کچھ نہیں کہتا۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ جب تک وہ صبح اٹھ کر خاموشی سے اسکول جاتا ہے، کلاس کی آخری بنچ پر بیٹھنے کے لیے، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔

اسکول میں کیا ہوتا ہے اس نے آج تک مجھے نہیں بتایا۔ اور نہ ہی میں نے پوچھا۔ وہ منھ سے ایک لفظ نکالے بغیر اسکول جاتا ہے، اور واپس آ جاتا ہے۔ پانچویں یا چھٹی جماعت میں ایک مختصر سا وقفہ آیا تھا جب بچوں نے اسے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ ایسا لگتا تھا گویا بچوں نے اسے اچانک دریافت کیا ہو، اور وہ مستعدی کے ساتھ اس کی دل آزاری میں لگ گئے۔ اس کی کلاس کے تمام بچے، لڑکیوں سمیت، وقفے کے دوران اس کے گرد گھیرا ڈال لیتے اور اس کے ہاتھ پیروں میں چٹکیاں کاٹتے، گویا اطمینان کرنا چاہتے ہوں کہ وہ گوشت پوست کا جسم رکھتا ہے، انسانی وجود رکھتا ہے۔ لیکن وہ اس کے باوجود اسکول جاتا رہا۔ واقعتاً مَیں مصر رہا کہ وہ برابر جاتا رہے۔

کچھ ہفتوں بعد بچوں نے اسے تنگ کرنا ترک کر دیا، اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

ایک دن جب وہ اسکول سے لوٹا تو شدّتِ جذبات سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کے ہاتھ چاک سے اٹے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا شاید اسے بلیک بورڈ کے سامنے بلایا گیا ہو گا، لیکن اس نے کہا "نہیں۔" اس شام وہ خود میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ اسے کلاس کا مانیٹر مقرّر کیا گیا ہے۔

کچھ دن گزر گئے۔ میں نے اس سے پوچھا کیا وہ اب تک مانیٹر ہے؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ دو ہفتے بعد بھی اس کی تقرری برقرار تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ ذمےداری نبھانے میں اسے مزہ آ رہا ہے یا مشکل ہو رہی ہے۔ وہ بےحد مطمئن تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات گمبھیر ہو چلے تھے۔ صبح اس کے بستے کی تلاشی لیتے ہوئے مجھے اکثر اس کے عجیب و غریب ہوم ورک کے علاوہ، چاک کے ٹکڑے اور بورڈ صاف کرنے والا کپڑا نظر آتا۔

میرا خیال ہے تب سے لے کر وہ اسکول کے آخری دن تک کلاس کا مانیٹر رہا، اور اسکول کے چوکیدار کے ساتھ کافی مانوس ہو گیا۔ آخری سالوں میں تو ان کی آپس میں ایک طرح سے دوستی بھی ہو گئی تھی۔ اکثر چوکیدار اسے اپنی کوٹھری میں بلاتا اور کسی استاد کا چھوڑا ہوا چائے کا کپ پیش کرتا۔ اس کا تو امکان کم ہی ہے کہ ان میں واقعی کبھی کوئی بات چیت ہوئی ہو، لیکن ایک طرح کا تعلق سا پیدا ہو گیا تھا۔

گرمیوں کی ایک شام مَیں اتفاقاً اس کے اسکول کے قریب آ نکلا۔ میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چوکیدار سے سلام دعا کرتا چلوں۔ گیٹ بند تھا۔ میں باڑھ کے ایک سوراخ سے

راستا پستا اندر داخل ہوا، اور تاریک سنسان برآمدوں سے ہوتا ہوا چوکیدار کی کوٹھری تک جا پہنچا۔ یہ کوٹھری سیڑھیوں کے نیچے تھی۔ میں کوٹھری کو جانے والے زینے پر اترا تو وہ نظر آیا۔

وہ بستر پر ٹانگیں اوپر کیے بیٹھا تھا۔ کوٹھری کا باقی حصہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ پست قد، موٹا سا آدمی۔ وہ ٹخنوں پر رکھی ہوئی ٹانبے کی ٹرے کو پالش سے چمکا رہا تھا۔ میں بیت اتار کر کوٹھری میں سکڑتا ہوا داخل ہوا اور بچے کا نام بدبدایا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، اور نہ میرے آنے پر کسی حیرت کا اظہار کیا۔ گویا اسے یقین تھا کہ میں ایک نہ ایک شام اس کے پاس ضرور آؤں گا۔ اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور اچانک منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر مسکرانے لگا۔ ایک خاموش مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل گئی۔

"تم میرے بیٹے کو جانتے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے چہرے پہ اب تک مسکراہٹ تھی اور وہ ٹرے کو چمکائے جا رہا تھا۔

"کیسا لڑکا ہے وہ؟ اچھا بچہ...."

اس کی مسکراہٹ سرد پڑ گئی۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ وہ کچھ بڑبڑایا اور اپنے سر کی طرف اشارے میں انگلی ہلائی۔

"بےچارہ بچہ... پاگل..." اور میرے چہرے کو غور سے دیکھتا رہا۔

میں اس کے سامنے خاموش کھڑا رہا۔ میرا دل منجمد ہو چکا تھا۔ جس سے پہلے کبھی مجھے اتنی شدید مایوسی نہ ہوئی تھی جتنی اس لمحے ہوئی۔ چوکیدار دوبارہ پالش میں جت گیا۔ میں ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل آیا۔

اس سب باتوں کا یہ مطلب نہیں کہ شروع ہی سے بچے کا خیال میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ شاید معاملہ اس کے برعکس تھا۔ میں اس سے الگ تھلگ رہتا۔ غائب ذہن، دوسری چیزوں کے بارے میں سوچتا رہتا۔

اپنے بارے میں...

اس سے پہلے میں اپنی ذات میں کبھی اس حد تک گم نہ ہوا تھا۔

پہلی چیز تو میری خاموشی تھی۔ میری ابدی خاموشی۔ ہاں، میں نے اسے برقرار رکھا تھا۔ اور یہ کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں نے ایک سطر تک نہ لکھی تھی۔ یہ سچ ہے کہ کبھی ایک مبہم سی آرزو میرے اندر انگڑائی لیتی کہ میں کچھ کہوں۔ اور میں خود سے سرگوشی کرتا، مثلاً، خزاں۔ اور پھر، خزاں۔

بس، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

"دوست میری سن گن لیتے۔ "ناممکن"، وہ کہتے، "تم چپکے چپکے کچھ لکھ رہے ہو۔ کچھ کہتے رہتے ہو۔ تم ہم سب کو اپنی تخلیق سے اچانک حیران کرنا چاہتے ہو...."

اور میں جذباتی سا ہو جاتا۔ مسکراتا، اور کہتا، "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا، کہہ چکا۔"

پہلے تو انہیں میری بات پر شبہ رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ یقین آ گیا۔ اور میری خاموشی کو لوگوں نے بالآخر خاموشی سے قبول کر لیا۔ صرف ایک دفعہ اس کا ذکر آیا۔ کسی نے (ایک نوجوان نے) ایک اخبار کے لیے شاعری پر ایک طرح کا جائزہ لکھا جس میں میرا نام بھی یونہی لے دیا، اور حقارت سے میری خاموشی کو بانجھ پن پر موقوف کیا۔ ایک پیراگراف میں اس نے دو دفعہ میرے لیے یہ لفظ استعمال کیا، بانجھ۔

اور اس پر میرا تذکرہ ختم کر دیا۔

لیکن میں نے پروا نہ کی۔ میں پُرسکون رہا۔

میرے اطراف یہ ویرانہ....

بنجر صحرا...

چٹانیں اور راکھ...

دوسری چیز یہ کہ مجھے بڑھاپے نے آ لیا تھا۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ یہ حال ہو جائے گا۔ جب تک میں شہر میں گھومتا ہوں سکون سے رہتا ہوں۔ لیکن شام کو کھانے کے بعد جب ہاتھ میں کتاب یا اخبار تھامے، آرام کرسی میں دھنس جاتا ہوں تو کچھ دیر بعد مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مجھ پر فالج گر پڑا ہو، جیسے میں تقریباً ختم ہو چکا ہوں۔ میں کوشش کر کے کرسی سے اٹھتا ہوں، بڑی مشکل سے لباس تبدیل کر پاتا ہوں۔ میری بوڑھی ٹانگیں کپکپاتی ہیں۔ اپنی بےجان ٹانگوں کو گھسیٹتا، بستر میں آ گرتا ہوں، لحاف میں دبک کر گول مول ہو جاتا ہوں۔ اس تمام جدوجہد میں کتابیں گر کر ادھر اُدھر بکھر جاتی ہیں۔ یہ وہ جاسوسی ناول ہیں جن کو میں پچھلے دنوں سے بےحد دلچسپی کے ساتھ پڑھنے لگا ہوں۔

گھر خاموشی میں ڈوبا ہوتا ہے۔ ایک بھولا بھٹکا نغمہ ریڈیو سے پھوٹتا ہے۔ میں کتاب پڑھتا ہوں۔ اور آہستہ آہستہ، انجانے میں، کائی جمی چٹان میں تبدیل ہو جاتا ہوں۔ آدھی رات کو ریڈیو خاموش ہو جاتا ہے اور کتابیں میرے ٹخنوں سے پھسل کر نیچے گر جاتی ہیں۔ مجھے ریڈیو بند کرنا ہے اور بتّی بجھانی ہے۔ تب وہ بھیانک لمحہ آتا ہے، خوف کا وقت۔ میں بستر سے ایک بےجان لاش کی طرح نیچے گر جاتا ہوں۔ درد سے ادھ موا، گھسٹتا ہوا، جسم میں بچی کھچی طاقت کے ساتھ سوئچ تلاش کرتا ہوں۔

ایک مرتبہ، آدھی رات کو میں نے ہال میں اس کے قدموں کی چاپ سنی۔ میں یہ بتاتا چلوں کہ اس کو بڑی بےسکون نیند آتی تھی۔ اس کو ڈراونے خواب نظر آتے تھے۔ خواب، جنہیں وہ بیان نہ کر سکتا تھا۔ رات گو مدّھم سی روشنی اس کے بستر کے قریب جلتی رہتی، اور چپ اس کی آنکھ کھلتی، وہ سیدھا باورچی خانے کے نل کے قریب جاتا اور کئی گلاس پانی کے چڑھا جاتا جس سے اس کے خوف میں کمی آتی۔

اس رات جب وہ پانی پی کر واپس جا رہا تھا تو میں نے اسے آواز دے کر کمرے میں بلایا اور بتّی بجھانے اور ریڈیو بند کرنے کے لیے کہا۔ مجھے آج بھی تاریک گزرگاہ میں کھڑا اس کا وہ بیولا یاد ہے۔ اس لمحے اچانک مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے۔ اس کے جسم پر گوشت چڑھ چکا تھا۔ پشت پر پڑتی ہوئی روشنی اس کے نیم وا دہانے کے سائے کو واضح کر

Scanned with CamScanner

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

اگلی رات اس نے پھر آدھی رات کے قریب گھر میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ مجھے اس کے قدموں کی آہٹ کا انتظار تھا۔ میں نے ایک دفعہ پھر بتی بجھانے کے لیے اسے اندر بلایا۔

اور اس کے بعد ہر رات...

اس طرح اس کی خدمتوں نے مجھے گھیرنا شروع کر دیا۔ میں ان پر انحصار کرنے لگا۔ یہ سلسلہ رات کو بتی بجھانے اور ریڈیو بند کرنے سے شروع ہوا اور دوسرے کئی کاموں تک پھیل گیا۔ کیا عمر تھی اس کی؟ تیرہ سال کا ہو گا، میرا خیال ہے...

ہاں، اب مجھے یاد آیا۔ اس کی تیرھویں سالگرہ انھی دنوں پڑنے والی تھی اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس دفعہ اس کی سالگرہ مناؤں گا۔ کیونکہ اب تک میں اس کی سالگرہ پر خاموشی اختیار کرتا چلا آیا تھا۔ میں نے ایک عمدہ، فیاضانہ سی پارٹی دینے کا تہیہ کیا۔ میں نے اس کے کلاس ٹیچر سے بات کی اور دوسرے اساتذہ کو بھی مدعو کیا۔ اس کی جماعت کے سارے بچوں کو دعوت نامے بھیجے۔

یہ سچ ہے کہ اس کی کلاس میں تمام بچے عمر میں اس سے چھوٹے تھے۔ بہ مشکل گیارہ سال کے ہوں گے...

سالگرہ کے دن، ہفتے کے روز، صبح بڑی دیر سے ایک کٹھن انتظار کے بعد دس کھسرپھسر کرتے لڑکوں کا ایک گروہ ہمارے گھر میں نمودار ہوا۔ ہر لڑکے کے ہاتھ میں سفید کاغذ میں بندھا ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا۔ ایک بھی استاد نے آنے کی زحمت نہ کی تھی۔ اور نہ کلاس کی کوئی لڑکی آئی تھی۔

بےحد بوکھلاہٹ میں ان سب نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ وہ میرے سفید بالوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ (ایک لڑکے نے سرگوشی میں پوچھا، "کیا یہ اس کا دادا ہے؟") خائف سے وہ ہمارے گھر کے اندر داخل ہوئے جہاں وہ پہلے کبھی نہ آئے تھے۔ انھوں نے مجھے غور سے دیکھا اور دیر تک میری حرکات کا مشاہدہ کرتے رہے۔ اور جب انھوں نے مجھے بظاہر صحیح العقل پایا تو اطمینان کا سانس لیا۔

تحفے کھولے گئے۔

معلوم ہوا سب ایک ہی چیز تحفے میں لائے تھے۔ پنسلوں کا سستا سا ڈبا۔ تمام پیکٹوں سے یہی نکلا سوائے ایک کے۔ وہ گھونگھریالے بالوں والا، کمزور، شاعر قسم کا بچہ ایک پرانا زنگ آلود جیبی چاقو لایا تھا۔ وہ ایک بڑا سا چاقو تھا جس کے کئی پھل تھے۔ تمام بچوں نے اس چاقو کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

سارے تحفے روایتی مبارک باد کے رقعوں کے ساتھ پیش کیے گئے تھے۔ جیبی چاقو والے شاعر بچے نے چند دلچسپ اشعار بھی لکھے تھے۔

شدید اضطراب میں، اس نے خاموشی سے تحفے قبول کیے۔

میں نے ہر ایک کی آؤبھگت کی۔ سب کو کیک، سینڈوچ، ٹافیاں، شربت اور آئس کریم پیش کی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بکھرے ہوئے بیٹھے تھے، آرام کرسیوں اور صوفوں میں دھنسے ہوئے، خاموشی سے ٹافیاں چباتے ہوئے۔ ان کی آنکھیں مسلسل گردوپیش کا جائزہ لیتی رہیں، جیسے انھیں کچھ شبہ ہو۔ کبھی کبھار اچانک دو تین بچے ٹھی ٹھی کرنے لگتے، بغیر کسی وجہ کے۔

میرا بیٹا کمرے کے کونے میں تنہا بیٹھا تھا۔ جس کے اعزاز میں وہ تقریب منعقد کی گئی تھی، اس تقریب میں وہ ایک ملاقاتی کی طرح الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اس کے بھی منہ میں کچھ تھا، لیکن اس کی نظریں نیچی تھیں۔

میں نے سوچا شاید میری موجودگی سے بچے جھجک رہے ہوں، لہٰذا کمرے سے باہر نکل آیا۔ اور واقعی جیسے ہی میں باہر آیا، کمرے میں قہقہے ابلنے لگے۔ جب میں تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو دیکھا وہ سب جوتے اتارے ہوئے، قالین اور صوفوں پر اچھل کود رہے تھے۔ وہ وہاں موجود نہ تھا۔ میں اس کی تلاش میں کمرے سے نکلا۔ وہ باورچی خانے کی بالکنی میں بیٹھا لڑکوں کے جوتے صاف کر رہا تھا۔

"میں مانیٹر ہوں"، اس نے کہا۔ اور اس طرح اس کی سالگرہ کی تقریب اختتام کو پہنچی۔ ان کے کپڑے کھیل کود سے گندے ہو چکے تھے۔ ہنسی دباتے ہوئے، انھوں نے جوتے پہنے، ایک ایک کر کے مجھ سے ہاتھ ملائے اور رخصت ہوئے۔ اپنے پیچھے پنسلوں کے نو ڈبے چھوڑ گئے۔ جہاں تک جیبی چاقو کا تعلق ہے، جو سب کو اتنا پسند آیا تھا، وہ ننھے شاعر نے میرے بیٹے سے ایک ہفتے کے لیے ادھار مانگ لیا۔ اور کبھی واپس نہ کیا۔

میں اپنے دفاع میں یہ تمام تفصیلات بتا رہا ہوں۔ کیونکہ چند ہفتوں بعد وہ میرے بھی جوتوں پر پالش کرنے لگا۔ میں جوتے بالکنی میں چھوڑ دیتا، اور ان پر پالش ہوئی ہوتی۔ وہ بڑے شوق سے یہ کام کرتا تھا، بغیر کسی تردّد کے۔ یہ ایک معمول بن گیا، میرا اور اس کا معمول۔ اور پھر اسی طرح کئی معمول بنتے چلےگئے۔

مثلاً میرے جوتے اتارنا۔ میں سہ پہر کے بعد دفتر سے گھر لوٹتا ہوں۔ ہال میں رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ کر اپنی ڈاک کھولتا ہوں۔ وہ کمرے سے نمودار ہوتا ہے، میرے قدموں میں بیٹھ جاتا ہے، فیتے کھولتا ہے، جوتے اتارتا ہے اور میرے پیروں میں سلیپر ڈالتا ہے۔

اس سے مجھے آرام ملتا ہے۔

اچانک مجھ پر انکشاف ہوتا ہے کہ میری ڈھلتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں اس کے بازوؤں میں قوت ہے۔ جب بھی مجھ سے کسی مرتبان کا ڈھکن نہیں کھلتا، دیوار سے کیل نہیں نکلتی، میں اس کو بلاتا ہوں۔ اس سے کہتا ہوں، "تم جوان ہو، طاقت ور ہو، میں کمزور ہوتا جا رہا ہوں، بہت جلد میں ختم ہو جاؤں گا۔"

لیکن مجھے اس سے مذاق نہیں کرنا چاہیے۔ وہ ٹھٹھول کا متحمّل نہیں ہو سکتا۔ وہ

Scanned with CamScanner

وہ کوڑے کی بالٹی خالی کرنے کا عادی ہے۔ یہ وہ آٹھ سال کی عمر سے کرتا چلا آ رہا ہے۔ وہ میرے چھوٹے موٹے کام کرتا ہے، سگریٹ لانا، اخبار خریدنا۔ اس کے پاس کافی وقت ہوتا ہے۔ وہ ہوم ورک میں آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں لگاتا۔ اس کا کوئی دوست نہیں۔ وہ کچھ نہیں پڑھتا۔ بس کرسی میں دھنسا، گھنٹوں دیوار کو گھورتا رہتا ہے۔ ہم ایک خاموش سے محلّے میں رہتے ہیں۔ کھڑکی میں صرف درخت نظر آتے ہیں اور ایک باڑھ۔ یہ ایک پرسکون سی گلی ہے۔ اس کے لیے کرنے کو ہے ہی کیا؟ جانوروں سے اسے دلچسپی نہیں۔ میں نے اسے ایک مرتبہ کتے کا پلا لا کر دیا لیکن وہ ایک ہفتے کے اندر ہی اسے کھو بیٹھا، اور کسی افسوس کا اظہار نہ کیا۔ اس کے لیے کرنے کو ہے ہی کیا؟ میں اسے گھر کی صفائی کرنا سکھاتا ہوں۔ اسے بتاتا ہوں کہ کون سی چیز کہاں رکھنی چاہیے۔ وہ آہستہ آہستہ سمجھ جاتا ہے اور الماری میں میرے کپڑے تہہ کر کے سلیقے سے رکھنا سیکھ لیتا ہے۔ فرش پر بکھرے ہوئے اخبار اور کتابیں اکٹھا کرتا ہے۔ صبح جاتے ہوئے میں شب خوابی کا لباس بستر پر چھوڑ جاتا ہوں۔ جب واپس آتا ہوں تو ہر چیز قاعدے قرینے سے اپنی جگہ رکھی ملتی ہے۔

کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کسی سفر کے لیے میری تمام چیزیں تیار رکھی ہوں۔ بس صرف ایک سوٹ کیس کھولنے کی دیر ہے۔ اس میں محبت سے تہہ کیے کپڑے ڈالوں اور چل پڑوں۔ یک دن مجھے ایک مختصر سے سفر پر شمال جانا پڑ گیا۔ اس کو بتانے کے آدھ گھنٹے کے اندر اندر اس نے میرا سوٹ کیس تیار کر کے دروازے پر رکھ دیا تھا۔ اور میری چھڑی بھی تیار تھی۔

ہاں، پچھلے چند دنوں سے میں چھڑی استعمال کرنے لگا ہوں۔ گو کہ ابھی مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ جب میں گلی میں لوگوں سے باتیں کرنے کے لیے رکتا ہوں تو زمین میں کسی مناسب درز میں چھڑی ٹکا کر اپنا پورا وزن ڈال کر کھڑا ہوتا ہوں۔ وہ وقتاً فوقتاً چھڑی کی نوک تیز کرتا رہتا ہے تاکہ مجھے اس کام میں آسانی رہے۔

میرے آرام کے لیے وہ اتنی باریکیوں میں جاتا ہے۔

ان دنوں اس نے کھانا پکانا سیکھ لیا تھا۔ اس کام اس نے عمررسیدہ ملازمہ سے سیکھا تھا جو کبھی کبھار صفائی کے لیے آتی تھی۔ شروع میں تو اس نے صرف اپنے لیے پکانا شروع کیا جو وہ میرے آنے سے پہلے ہی اکیلے بیٹھ کر کھا لیتا تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اس نے میرے لیے بھی پکانا شروع کر دیا۔

ایک مختصر، سادہ سا کھانا، اتنا خوش ذائقہ تو نہیں لیکن سلیقے سے پیش کیا ہوا۔ اس نے دوچھتی سے ایک پرانا ڈنر سیٹ ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ شادی کا تحفہ تھا۔ یہ کافی بڑا سیٹ تھا جس میں مختلف سائز اور انواع و اقسام کے سنہری کناروں والے ڈونگے اور قابیں تھیں جن میں خوشنما پھول، تتلیاں، اور پروں والے ننھے منے بچے بنے ہوئے تھے۔ وہ یہ سیٹ استعمال میں لانے لگا۔ وہ میرے سامنے پانچ مختلف سائز کی پلیٹیں رکھتا، بہت سارے چھری کانٹے سجاتا اور

اس نے یہ سب کہاں سے سیکھا تھا؟

معلوم ہوا ایک بادشاہ کی ضیافت کی کہانی کلاس میں پڑھ کر سنائی گئی تھی۔

میں چونک پڑتا ہوں۔ "کون سا بادشاہ؟"

اسے نام یاد نہیں۔

"کہانی کے دوسرے ہیرو؟"

اسے یاد نہیں۔

میں اس سے کہتا ہوں کہ کم از کم کہانی ہی سنا دے۔

وہ شروع کرتا ہے لیکن پھر ایک دم خاموش ہو جاتا ہے جیسے کہانی اس کے ذہن میں گڈمڈ ہو گئی ہو۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ اس کے رخساروں پر بلوغت کے پہلے مہاسے نکل رہے ہیں۔

مجھے خیال آتا ہے، اس کو اگر اس وقت دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو دیکھنے والے کو اس کا چہرہ دیکھ کر خوف آ جائے۔

رات میں وہ مجھے ٹب کا غسل لینے میں مدد دیتا ہے۔ میں بیٹھ کر صابن ملوانے کے لیے اسے آواز دیتا ہوں، اور وہ دبے پاؤں غسل خانے میں داخل ہوتا ہے، پانی میں میری برہنگی سے ہیبت زدہ۔ وہ اسفنج اٹھاتا ہے اور احتیاط سے میری گردن پر ملنا شروع کرتا ہے۔

جب میں اس کی کوئی خدمت کرنا چاہتا ہوں تو مجھے کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ دفتر سے واپسی پر میں اعلان کرتا ہوں، "آج کھانا میں پکاؤں گا!" مگر کھانا تیار ہو چکا ہوتا ہے۔ میں اسے غسل میں مدد دینا چاہتا ہوں۔ پتا چلتا ہے وہ پہلے ہی نہا دھو چکا ہے۔

لہٰذا میں رات کو اسے اپنے دوستوں کے پاس لے چلتا ہوں، فنکاروں کے جلسوں اور ادبی محفلوں میں لے جاتا ہوں، کیونکہ میں اب تک کئی انجمنوں کا ممبر ہوں۔ اس طرح میں نے لوگوں کو اس کی موجودگی کی عادت ڈلوا دی ہے اور اب وہ اس کا کوئی نوٹس نہیں لیتے، جیسے اب میں ان کے سایوں کو نوٹ نہیں کرتا۔

وہ ہمیشہ آخری صف میں بیٹھتا ہے۔ دیر سے آنے والوں کے لیے دروازہ کھولتا ہے، کوٹ اتارنے میں ان کی مدد کرتا ہے اور کوٹوں کو ٹانگتا ہے۔ لوگ اسے خدمت گار سمجھتے ہیں۔ اور واقعتاً وہ خدمت گاروں ہی کے ساتھ رہتا ہے۔ میں اکثر اسے گیٹ کیپروں کے نزدیک، سنجیدگی سے ان کی باتیں سنتے ہوئے، کھڑا پاتا ہوں۔ ایک آدھ دفعہ میں نے اسے صفائی کرنے والی عورت سے بات کرتے دیکھا جو اپنی جھاڑو اٹھائے کھڑی تھی۔

وہ اس سے کیا بات کرتا ہے؟ میں آج تک نہیں بوجھ پایا ہوں۔

کیا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے۔ لگتا ہے میرے رویّے میں کوئی ایسی بات ہے جو اسے خوف زدہ کر دیتی ہے۔ شاید میری عمر یا میری خاموشی۔ جو کچھ بھی ہو، وہ

Scanned with CamScanner

میری موجودگی میں یوں سہما رہتا ہے جیسے اسے کسی بھی وقت چانٹا پڑنے کی امید ہو۔

حیرت ہے۔ کیونکہ ہم دونوں کے درمیان صلح و امن ہے۔ دی سکوں سے گزر رہے ہیں۔ اور میرا خیال تھا یہ سکوں، یہ خاموشی زندگی بھر رہے گی۔ میرا مطلب ہے جب تک ہم دونوں کا ساتھ ہے۔ میں سوچتا تھا میں کتنا خوش نصیب ہوں کہ اپنی اس خاموشی کے دوران میرا واسطہ ایک کندذہن لڑکے سے ہے، وہ جو خرد و جنوں کی سرحد پر ہے، مجھ سے دور۔

یہ سچ ہے کہ کبھی کبھی میرے اندر ایک خواہش جاگتی ہے کہ میں کسی سے چمٹ جاؤں۔ اور پھر میں پروشلم بھاگتا ہوں، گھنٹے دو گھنٹے کے لیے بینیوں کے پاس چلا جاتا ہوں۔ وہ میری اچانک آمد سے حیران رہ جاتی ہیں۔

وہ مجھ سے محبت سے ملتی ہیں، میری گردن میں جھول جاتی ہیں، مجھ سے بغل گیر ہوتی ہیں۔ اور جب ہم ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کھڑے ہوتے ہیں، ان کے شوہر یہ منظر دیکھتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں ہلکی سی حقارت ہوتی ہے۔ پھر ہم بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں، لفظوں سے کھیلتے ہیں اور شگوفے چھوڑتے ہیں۔ بذلہ سنجی کے اس مظاہرے سے ان کے شوہروں کو سخت بیزاری ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس بیزاری کا اظہار لفظوں میں نہیں کرتے، شکایت کا ایک لفظ بھی زبان پر نہیں لاتے۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ اگر میں ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا ہوں تو رخصت بھی اسی طرح ہوتا ہوں۔ ایک دو گھنٹے بعد میں اٹھ کھڑا ہوتا ہوں، اپنی آرزو کی تلچھٹ دل میں لیے۔ وہ سب مجھ سے کچھ دیر اور رکنے کو کہتے ہیں، رات گزارنے پر اصرار کرتے ہیں، لیکن میں کبھی نہیں ٹھہرتا۔ مجھے بینے کے پاس جانا ہے، میں دلیل دیتا ہوں، گویا اس کے وجود کا انحصار میری موجودگی پر ہو۔ ہم ایک دوسرے سے دوبارہ لپٹ کر پیار کرتے ہیں۔ پھر ان کے شوہر مجھے اسٹیشن تک چھوڑنے آتے ہیں۔ اس وقفے میں ہمارے درمیان شاذ و نادر ہی بات ہوتی ہے۔ ہمارے پاس ایک دوسرے سے کہنے کو کچھ نہیں ہوتا۔ اور پھر میں ان کی نظروں میں مشکوک ہوں۔ میری پشت پر بل کھاتی ہوئی یہ سفید چوٹی، اور میرے ہاتھوں میں لہراتی ہوئی یہ چھڑی۔ میں اب تک ان کی نظروں میں ایک شاعر ہوں۔ میرے مجموعے، مجھے معلوم ہے، ان کے ڈرائنگ روم کی الماری میں نمایاں جگہ پر رکھے ہوئے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟

ایسے موقعوں پر مجھے اپنے بیٹے کا بےوقوف سا چہرہ ہی پسند ہے۔

سردیوں میں اکثر میں گھر کی چٹخنیاں شام چھ بجے ہی چڑھا لیتا ہوں۔ اور پھر سونے کے وقت تک کیا کرتا ہوں؟ اخبار پڑھتا ہوں، ریڈیو سنتا ہوں، کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہوں۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور میں خلوت میں بوریت سے مول تول کرتا رہتا ہوں۔

گرمیوں میں میں ساحل پر ٹہلتا ہوں، یا سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا ہوں۔ اکثر میں کسی تعمیر ہوتی ہوئی عمارت کے سامنے رک جاتا ہوں اور سوچ میں ڈوبا گھنٹوں کھڑا رہتا ہوں۔

فضول خیالوں میں گم۔۔۔

برسوں پہلے، میں جہاں کہیں بھی جاتا اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی بیاض رکھتا۔ پاگلوں کی طرح، جیسے کسی بخار میں پھنکتا ہوا۔ تخلیق کے شعلوں کو ہوا دیا کرتا۔ شعر جوڑتا۔ قافیے

ملاتا، لفظوں کو الٹا پلٹتا۔ اور آج کل۔۔۔ کوئی ہوک نہیں اٹھتی۔

وہ کہاں ہے؟

میں کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں۔ وہ باغ میں ہے۔ ایک سونی خزاں کے آسمان کے نیچے، وہ درختوں اور جھاڑیوں کی وحشیانہ طریقے سے کاٹ چھانٹ کر رہا ہے، پوری پوری شاخیں اڑا رہا ہے، پتوں کو نوچ رہا ہے۔ سب سے زیادہ جھنجھلاہٹ اسے پرانے چنار کے درخت پر ہے۔ اس کے تنے کے قریب پھوٹتی شاخوں کو وہ بےرحمی سے اڑا رہا ہے، درخت پر چڑھ کر اس کی پھیلتی ہوئی سبز شاخوں کو کاٹ رہا ہے۔ درخت اس کے بوجھ سے جھکتا ہے، اور کراہتا ہے۔

کبھی کبھی میری آنکھیں گھنٹوں اس پر لگی رہتی ہیں، اور میں کوشش کے باوجود اس پر سے نظریں نہیں ہٹا پاتا۔ اس کی پُرعزم گمبھیرتا، اس کی تُندی۔ شام کے سائے اس کے چہرے پر رینگ رہے ہیں۔ اور وہ احمقانہ حد تک پڑھاکو لگ رہا ہے، اس موٹے شیشوں کی عینک کی وجہ سے، جو اس نے حال ہی پہننا شروع کی ہے۔ اس کی دور کی نظر کمزور ہے۔

مجھے معلوم ہے وہ ضرورت سے زیادہ کاٹ چھانٹ کر رہا ہے، اپنی تُندی میں پودے جڑوں سمیت اکھاڑ کر پھینک رہا ہے۔ لیکن میں پھر بھی اس کو نہیں روکتا۔ کھڑکی میں خاموش کھڑا دیکھتا رہتا ہوں۔ اپنے آپ سے کہتا ہوں، "جو پودے بچیں گے، وہ بہار میں پھول دیں گے اور اس نقصان کا ازالہ ہو جائے گا"۔

پہلی دفعہ اسے کب پتا چلا تھا کہ میں شاعر ہوں؟ میرا مطلب ہے یہ جو پاگل پن ہے جس نے ہم دونوں کو پچھلے ایک سال سے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔

پچھلی سردیوں کے آخر میں میں بیمار پڑ گیا۔ میں نے اسکول سے کچھ دنوں کے لیے اس کی چھٹی کروا دی تاکہ وہ میری تیمارداری کر سکے۔ کئی دنوں تک ہم تمام وقت مسلسل ایک ساتھ رہے۔ وہ میرے پاس سے ہلا تک نہیں۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا، کوئی دن نہ جاتا تھا جب میں شام کو باہر نہ نکلتا، آوارہ گردی کے لیے، لوگوں سے ملنے کے لیے، کیفے میں بیٹھنے کے لیے۔

میں بستر میں پڑا بخار میں پھنک رہا تھا۔ وہ گھر میں ٹہلتا یا اپنی نظریں مجھ پر جمائے، میرے کمرے کے دروازے پر بیٹھا رہتا۔ کبھی میں اس سے چائے مانگتا، اور وہ اٹھ کر باورچی خانے جاتا اور میرے لیے گرم گرم چائے کا کپ لاتا۔

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ سرمئی آسمان نے کھڑکیوں کو ڈھانپ دیا تھا۔ ہم نے گھر کی بتیاں روشن نہیں کی تھیں کیونکہ بیماری سے میری آنکھیں بےحد حساس ہو گئی تھیں۔

ہمارے درمیان بےپایاں خاموشی تھی۔ کیا میں اس سے کوئی بات کر سکتا تھا؟

کیا اس نے ہوم ورک کر لیا ہے؟

اس نے کمرے کے دوسرے کنارے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں اس سے کیا بات کر سکتا تھا؟

Scanned with CamScanner

میں نے اس سے پوچھا، کیا وہ اب تک کلاس کا مانیٹر ہے؟ اس نے گردن کی جنبشوں سے ہاں اور نہیں میں جواب دیا۔

آخرکار میں تھک گیا اور اپنا سر تکیے پر گرا کر آنکھیں موند لیں۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ باہر پھوار پڑنے لگی۔ ان دنوں بیماری کے دوران میرے ذہن نے ادھر ادھر بھٹکنا شروع کر دیا تھا۔ عجیب و غریب خیالات آیا کرتے۔ میں بستر کے بارے میں تصور کرتا کہ وہ سفید، وسیع پہاڑوں اور تند دریاؤں کی ایک ہیبت ناک سرزمین ہے اور میں اس کی کھوج میں ہوں۔

اور پھر گمبھیر سکوت۔ میرے جسم کے ہر خلیے کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہوئی بستر کی وہ گرمی۔

اور اس رستی ہوئی خاموشی میں اس کی کھردری آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"بابا، تم کیا کرتے ہو؟"

میں نے آنکھیں کھولیں۔ وہ دروازے کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں مجھ پر تھیں۔

حیرت زدہ، میں نے تکیے کے سہارے اٹھنے کی کوشش کی۔

"کیا؟ کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا کرتا ہوں؟ ابھی؟ میں اونگھ رہا ہوں...."

"نہیں، عام طور پر...." اور اس نے دوسری طرف منھ پھیر لیا، جیسے یہ سوال کر کے شرمندہ ہو۔

مجھے اس کا سوال سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ وہ میرے کام کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

کیا کلاس میں پیشوں کے بارے میں گفتگو ہوئی تھی؟

اسے معلوم نہیں۔

میں اسے اپنے کام کے بارے میں بتاتا ہوں۔ (میں اخبار کے تراشے جمع کرنے والے ایک دفتر میں ملازم ہوں۔) اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ میں تفصیل سے اس کو اپنے کام کے بارے میں بتاتا ہوں۔ لیکن اچانک وہ میرے کام کی نوعیت کو سمجھ جاتا ہے۔ اس پر کوئی ردعمل نہیں ہوتا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ کچھ مایوس ہوا ہو۔ میں سمجھ نہیں پاتا کیوں۔ اس کے کمزور ذہن میں یہ خیال تو نہیں آ سکتا تھا کہ میں پائلٹ یا جہاز کا کپتان ہوں۔ کیا اس کا خیال تھا میں ہوائی جہاز اڑاتا ہوں؟ یا جہاز رانی سے متعلق ہوں؟

نہیں۔

پھر، اس نے کیا سوچا تھا؟

اس نے کچھ نہیں سوچا تھا۔

دوبارہ سکوت ہو جاتا ہے۔ وہ کونے میں گم سم، اداس بیٹھا ہے۔ اس کی عینک شام کے دھندلکے میں چمک رہی ہے۔ بارش اب تیز ہو گئی ہے۔ بوڑھا چنار باغ میں سہما کھڑا ہے، آنسوؤں میں بھیگا ہوا۔ اچانک مجھ سے اس کا غم برداشت نہیں ہو پاتا۔ میں بستر میں اٹھ بیٹھتا ہوں۔ اندھیرے میں میری آنکھیں پوری کھل جاتی ہیں، اور میں اس سے سرگوشی میں

تھا ہوں۔ درحقیقت میں [illegible] اور بھی کرتا تھا۔ میں شاعری کرتا تھا۔ تمہارا باپ کبھی ایک شاعر تھا"۔ میں ہیجانی کیفیت میں پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں۔ کتابوں کے طاقچے کے پاس جاتا ہوں اور ایک ایک کر کے اپنے مجموعے نکالتا ہوں۔

وہ مجھے خاموشی سے دیکھتا ہے۔ اس کی عینک ناک پر کھسکی ہوئی، اس کے بازو کرسی کے ہتھے پر بےجان سے پڑے ہوئے۔

میں اس کی کلائی پکڑ کر، گھسیٹ کر اپنے سامنے کھڑا کرتا ہوں۔ میں خشک ہاتھوں سے اپنی کتابوں کے صفحے کھولتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے خشک صفحات، جن کو مدتوں سے چھوا نہ گیا تھا، میرے ہاتھوں میں ہلکے سے سرسراتے ہیں۔ بوسیدہ کاغذ پر الفاظ کی سیاہ لکیریں سامنے لہراتی ہیں۔ الفاظ: خزاں، بارش، ترکاری۔

اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ ساکت ہے، نظریں جھکائے، خاموش، بالکل غبی۔

میں نے اسے کمرے سے باہر بھیج دیا، اور اپنی کتابوں کو باہوں میں بھر کر پلنگ پر لے آیا۔ رات گئے تک میرے کمرے کی بتی روشن رہی، اور میں تمام رات چاہت کے اس میٹھے درد کو محسوس کرنے کی سعی ناکام کرتا رہا جو کبھی میں نے ان قدیم نظموں میں انڈیلا تھا۔ الفاظ: روٹی، راہگزر، رسوائی۔

دوسرے دن میرا بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ میں نے اس کو اسکول بھیجا، اور اپنے مجموعوں کو دوسری کتابوں کے بیچ میں ٹھونس دیا۔ مجھے یقین تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ دوسرے دن میں نے دیکھا میرے پانچوں مجموعے سلیقے سے ایک قطار میں لگے تھے۔ مجھے احساس ہوا نہ کسی چیز نے اس پر اثر کیا ہے۔ لیکن بس اتنا ہی۔

وہ اس کے اسکول کا آخری سال تھا۔ گو کہ اس حقیقت سے اس کی عادتوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ وہ اب بھی روزانہ شام کو آدھ گھنٹہ ہوم ورک کرنے میں گزارتا، کاپیوں میں جھکا کچھ لکھتا رہتا، اور پھر کاپیاں بند کرکے بستے میں رکھ دیتا اور گھر کے کام کاج میں لگ جاتا۔ کلاس میں وہ اب بھی اسی طرح کونے میں بیٹھتا، لیکن اب وہ کلاس میں حاضری کم دیتا تھا۔ چوکیدار اکثر اس کو اپنے پاس بلا لیتا، اور دوچھتی میں پرانے چولھے رکھواتے، اور تہ خانے میں ٹوٹے فرنیچر کی مرمت میں اس کی مدد لیتا۔

جب وہ کلاس میں ہوتا تو ہمیشہ کی طرح مکھی بیٹھا رہتا اور اس کی آنکھیں استاد پر مرکوز رہتیں۔

اسکول کے آخری دنوں کا وہ بجھا بجھا ماحول...

کلاسیں ختم ہونے سے دو تین ہفتے پہلے اس کی کلاس میں میری ایک نظم پڑھائی گئی۔ نصابی کتاب کے آخری صفحوں میں چند نظمیں شامل تھیں، غالباً کسی خالی گھنٹے میں پڑھانے کے لیے۔ ان میں میری بھی نظم تھی، برسوں پہلے لکھی گئی نظم۔ وہ میں نے نوعمروں کے لیے نہیں لکھی تھی، لیکن لوگ غالباً یہی سمجھے تھے اور اسی لیے اسے نصاب میں شامل کیا گیا تھا۔

استاد نے وہ نظم کلاس میں پڑھ کر سنائی، اور مشکل الفاظ کے معنی بتائے۔ پھر ایک

Scanned with CamScanner

استاد نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا نہ ہوتا "لیکن ہاں... یہ اس کے والد کی نظم ہے"۔

اس انکشاف سے نہ تو کلاس میں میرے لڑکے کی حیثیت پر کوئی اثر پڑا اور نہ نظم کی اہمیت بڑھی... بہرحال، کلاس ختم ہوتے ہی یقیناً نظم اور شاعر دونوں بھلائے جا چکے تھے۔

لیکن میرا بیٹا شاید اس بات کو نہ بھولا۔ اس کا چہرہ دمکتا رہا۔ غالباً وہ کلاس روم خالی ہونے کے بعد دیر تک وہاں منڈلاتا رہا۔ ہیجانی کیفیت میں فرش سے چھلکے چنتا رہا، بلیک بورڈ صاف کرتا رہا۔

میں جب شام کو لوٹا تو گھر میں اندھیرا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو اس کو اندھیرے میں منتظر پایا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکا۔ مجھ سے لپٹ گیا اور ایک وحشیانہ قسم کا واویلا شروع کر دیا۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ اس نے مجھے نہ جیکٹ اتارنے کی مہلت دی اور نہ ٹائی ڈھیلی کرنے کا موقع دیا، اور مجھے بازوؤں سے گھسیٹتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا۔ بتی جلائی، اپنی کتاب کھولی اور بھرائی ہوئی آواز میں میری نظم پڑھنے لگا۔ غلط سلط تلفظ، لفظوں کو نگلتا ہوا، آواز کو غلط جگہوں پر اٹھاتا ہوا۔

اس کی پرآشوب کیفیت دیکھ کر میں چکرا گیا۔ رحم سے میرا دل پھٹنے لگا۔ میں نے اس کو سینے سے چمٹا لیا اور اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔ یہ بات واضح تھی کہ وہ نظم کو سمجھ نہ سکا تھا، گو کہ نظم میں کوئی ایسے گہرے معنی نہ تھے۔

اس نے میری آستین پکڑ لی اور پوچھا کہ میں نے یہ نظم کب لکھی تھی۔

میں نے اسے بتایا۔

میری دوسری نظمیں کہاں ہیں؟

میں نے اپنے مجموعوں کی طرف اشارہ کیا۔

بس صرف یہ پانچ مجموعے یا کچھ اور بھی؟ اس نے پوچھنا چاہا۔

میں مسکرا دیا اور اپنی الماری کی ایک دراز کھول کر اسے دکھائی۔ دراز میں کاغذوں کے ٹکڑے، میری ادھوری نظمیں، بیاضوں کے اوراق بکھرے پڑے تھے۔

کیا آج میں نے کوئی نئی نظم لکھی ہے؟ اس نے سوال کیا۔ میں اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کا بیوقوف سا چہرہ اوپر اٹھا ہوا تھا اور وہ رشک و فخر سے مجھے تک رہا تھا۔ شام کا وقت تھا اور میں اب تک جیکٹ اور ٹائی میں ملبوس تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ اس کی پیدائش سے پہلے نظمیں لکھنا میں نے چھوڑ دی تھیں، اور دراز میں جو کچھ کباڑ جمع ہے وہ مجھے کبھی کا پھینک دینا چاہیے تھا۔

میں نے جیکٹ اتاری، ٹائی کو ڈھیلا کیا اور بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

وہ دوڑ کر میری چپلیں لے آیا۔

اس کے چہرے پر اداسی چھا گئی تھی۔

گویا اس نے کوئی بری خبر سن لی ہو۔

میں نے اس کے بال محبت سے پکڑے اور اس کا سر ہلایا۔

میں، جو اس کو چھونے سے گھبراتا تھا۔

چند دنوں بعد میں نے دیکھا کہ میری دراز کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے سارے کاغذ غائب تھے۔ ایک پرزہ تک نہ بچا تھا۔ میں نے اس کو باغ میں جا پکڑا۔ وہ ہاتھ میں کدال لیے درخت کے قریب خودرو جھاڑیاں صاف کر رہا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اس کا خیال تھا مجھے ان کاغذات کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اس نے دراز کی صفائی کر دی۔ کیا میں نے خود نہیں کہا تھا کہ میں لکھنا چھوڑ چکا ہوں؟

وہ سارے کاغذات کہاں چلے گئے؟

اس نے وہ سارے کاغذات پھینک دیے تھے جن پر کچھ لکھا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بیاضیں اس نے ردی میں بیچ ڈالی تھیں۔

میں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ زندگی میں دوسری دفعہ، اور اس دفعہ بھی چنار کے نیچے۔ میں نے اپنے بوڑھے ہاتھوں کی پوری طاقت سے اس کے کھردرے رخساروں پر چانٹے لگائے۔

وہ بری طرح کانپنے لگا...

اس کی منھیاں بھنچ گئیں۔ بیلچے میں اس کی انگلیاں گڑی رہ گئیں۔ وہ پلٹ کر مجھے مار سکتا تھا۔ اس میں اتنی قوت تھی کہ وہ مجھے مار گراتا۔

لیکن اچانک میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ تمام قصہ کتنا غیراہم تھا۔ پرانی نظموں کے نشانات۔ نظمیں جو کب کی گم ہو چکیں۔ یہ لرزش کیسی؟

کیوں؟ جب کہ میری خاموشی پر مہر ثبت ہو چکی ہے۔

اور پھر میں نے سوچا کہ چلو قصہ ہمیشہ کے لیے تمام ہوا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ تو آغاز تھا۔

گرمیوں کے طویل اکتا دینے والے دن۔ شفاف، نیلا آسمان۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا بادل کا ٹکڑا کسی خواب آگیں سفر پر آسمان کے ایک سرے سے تیرتا ہوا دوسری سمت نکل جاتا۔ تمام دن ہمارے چنار پر چڑیوں کے جھنڈ شور مچاتے۔

شامیں، سرخ، کھا جانے والی۔

بچے کا اسکول میں آخری دن۔

اور ایک دن بعد، سالانہ تقریب، اسناد کی تقسیم۔

اس کو ڈپلوما نہیں ملا، ظاہر ہے۔ بہرحال، وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ تقریب میں شریک ہوا۔ سفید قمیص اور خاکی پتلون پہن کر اسٹیج پر چڑھا (وہ کوئی سترہ سال کا ہو چکا تھا) اور دوپہر کی تیز دھوپ تلے بیٹھ کر تقریریں سنتا رہا۔ پرنسپل نے اساتذہ اور اسکول کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا۔ جب چوکیدار کا نام آیا تو میں نے دیکھا میرے بیٹے کی بصریں مجمعے میں اس کو تلاش کرنے لگیں۔ میں ہال کے آخری سرے پر کرسیوں کے انبار کے پیچھے

Scanned with CamScanner

شروع ہوا۔

دو موٹی تازی لڑکیاں اسٹیج پر چڑھیں اور کپکپاتی، جذباتی آواز میں اعلان کیا کہ وہ پیانو پر ایک دھن سنائیں گی جو کسی نامعلوم موسیقار نے کئی سو سال پہلے ترتیب دی تھی۔ وہ ایک پرانے پیانو کے پیچھے بیٹھ گئیں اور چار ہاتھوں سے اس میں سے اداس سے سر نکالنے لگیں۔

والدین نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔

ایک چھوٹا سا، گھونگھریالے بالوں والا لڑکا، ایک بڑا سا بربط اٹھائے اسٹیج پر آیا اور کسی دوسرے گمنام موسیقار کی دھن بجائی۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں۔

مجھے یہ گمنامی کا خیال اچھا لگا۔

والدین نے پھر والہانہ انداز میں تالیاں بجائیں۔

اچانک مجھے کسی کی نگاہوں کی گرمی محسوس ہوئی۔ میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر نرمی سے سر ہلایا۔

دو لڑکے اور دو لڑکیاں اسٹیج پر آئے اور کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ایک کہانی، ایک مزاحیہ خاکہ، دو تین نظمیں۔

نظموں کی آواز کانوں میں پڑتے ہی میرا بیٹا اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا اور پریشان نظروں سے مجھے تلاش کرنے لگا۔ حاضرین کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ معمّک، بےوقوف سا لڑکا اسٹیج کے نیچے لوگوں کے سامنے کھڑا کس کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کے ساتھیوں نے کھینچ کر اسے کرسی پر بٹھانا چاہا، لیکن وہ کھڑا رہا۔ اس کی نظریں میری تلاش میں ہال کے چاروں اطراف بھٹکتی رہیں۔ نظمیں اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں اور وہ دھیمے دھیمے ان کے سُروں پر سر ہلا رہا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا۔ لیکن وہ مجھے نہ پا سکا۔ میں نے خود کو کرسیوں کے بالکل نیچے تقریباً کبڑا کر لیا تھا۔

جیسے ہی تقریب اختتام کو پہنچی، میں نیڑی سے باہر نکل آیا۔ وہ شام کو گھر پہنچا۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ مہمانوں کے جانے کے بعد وہ چوکیدار کے ساتھ ہال میں کرسیوں کی ترتیب ٹھیک کرتا رہا تھا۔

وقت آ پہنچا تھا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا۔ میں اس بات کو دہراتا ہوں کہ وہ سرحد پر تھا، خرد و جنوں کی سرحد پر۔ کیا میں نے وقت کو یونہی گزرنے نہیں دیا؟ کیا وہ اب تک میرے قابو میں ہے؟

فی الحال وہ میرے ساتھ گھر میں رہنے لگا۔ وہ اپنے باپ کی دیکھ بھال کرتا، پھر وہ نظموں کی طرف متوجہ ہونے لگا۔

ہاں وہ اب تک بندی کرنے لگا تھا۔

کی تھیں اور نہ ہی ردّی میں بیچی تھیں۔ وہ سب کچھ اب تک اس کے پاس محفوظ تھا۔ اس نے چنار کے درخت کے نیچے اس نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔

مجھے وہ سارے کاغذات اکٹھے نہیں ملے۔ شروع میں اس نے یہ سب مجھ سے چھپانے کی کوشش کی۔ لیکن آہستہ آہستہ مجھے علم ہوتا گیا۔ کاغذ کے ننّھے منّے ٹکڑے گھر میں ادھر اُدھر اڑتے پھرتے، اس کی پتلون کی جیبوں سے جھانکتے، اس کے تکیے کے نیچے نظر آتے، اس کی چادر کے اندر کھڑکھڑاتے۔ اس نے ایک نئی عادت اپنا لی۔ میں جب اسے کسی کام سے باہر بھیجتا تو وہ کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالتا اور کام کی نوعیت اپنی بچکانہ، بڑی بڑی، ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں درج کر لیتا۔ املا کی غلطیوں سے بھرپور۔

"میں گمنامی میں ڈوب چکا ہوں"، ایک دن اچانک اس نے مجھے بتایا۔

میری چھڑی ٹوٹ گئی تھی اور میں نے اس کی مرمت کے لیے کہا تھا۔ فوراً اس نے ایک چھوٹی سی بیاض نکالی، میری پرانی بیاضوں میں سے ایک جو کبھی میری زندگی کا اٹوٹ حصہ تھیں، جن کو میں کتنی چاہت سے ہر وقت اپنی جیبوں میں رکھتا تھا تاکہ نظم آتے ہی اسے لکھ ڈالوں۔ کوئی بند، کوئی خیال، کوئی سطر۔

میرا حلق خشک ہو گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے پھوٹ نکلے۔ میرا ہاتھ خود بخود آگے بڑھا۔ اس نے فوراً بیاض میرے حوالے کر دی۔ میں نے کمزور لرزتے ہاتھوں سے اس کے صفحے پلٹے۔ سفید صفحے، نکالے ہوئے صفحوں کے کٹے ہوئے حصے۔ اور پھر ایک ٹوٹی پھوٹی سطر، میرے گھسیٹے ہوئے خط میں، "میں گمنامی میں ڈوب چکا ہوں"، اور پھر خالی صفحے، مڑے ہوئے کونے۔

مجھے سکوں ہو گیا۔ اس نے بیاض مجھے لوٹانا چاہی، لیکن میں نے اصرار کیا کہ وہ اسے اپنے پاس رکھے۔

وہ چلا گیا۔

اوپر اس کے کمرے میں جا کر میں نے اس کی میز کی تلاشی لی، لیکن مجھے کچھ نہ ملا۔ پھر میں نے اس واقعے کو فراموش کر دیا۔ شام کو میں نے اپنی میز پر پیلا سا کاغذ کا ٹکڑا دیکھا۔ اس میں میرے ہی خط میں تحریر تھا، "یہ نیلا آسمان، آدمیت کے مقابل۔۔۔"

اور "نیلا آسمان" ایک مدھم سی لکیر سے کٹا ہوا۔

میں اس کے کمرے کی طرف دوڑا۔ وہ وہاں بیٹھا تھا، میرے مبہم انتظار میں۔ میں نے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ کاغذ کا ٹکڑا تہہ کیا، اس کی میز پر رکھا اور کمرے سے نکل آیا۔ اس شام کھانے کے بعد مجھے پھر اپنی دو بھولی بھٹکی سطریں نظر آئیں،

"یہ وقت پھر تمہارے سامنے

یہ طویل، سست رو، سردیاں"

اور کاغذ میں نے اسی وقت پھاڑ دیا۔

اور دوسرے دن میرے نیڑھے میڑھے، تکلیف دہ خط میں،

Scanned with CamScanner

اور اس کے گرد درشتی اور تیزی سے مٹائے ہوئے الفاظ۔

اور اس پھٹے ہوئے کاغذ کے پاس گلدان میں ایک سرخ پھول رکھا تھا۔

اب میں پھولوں کے بارے میں بتاتا ہوں۔

گھر اب پھولوں سے بھر گیا تھا۔ طاقچوں سے، کونھری سے، پرانے بوسیدہ گلدان برآمد ہوئے اور پھولوں سے بھر گئے۔ وہ راستے میں چمپا جمع کرتا، باغوں سے گلنار چراتا، اور گھروں سے چوری چھپے گلاب توڑ کر لاتا۔ گھر تیز خوشبوؤں سے بھر گیا۔ زرد شاخیں میز پر بکھری رہتیں۔ مرجھائے ہوئے پھولوں کی پتّیاں قالین پر چرمراتیں۔

میری میز پر کورے کاغذ کے دستے سلیقے سے رکھے رہتے۔ تراشی ہوئی نوک دار پنسلیں قریب ہی رکھی ہوتیں۔

اور یوں اپنے غمی ذہن کی صاف میں وہ مجھے دوبارہ شاعری پر راغب کرنے کی کوشش میں لگ گیا۔

شروع میں میں کافی محفوظ ہوا۔ میں چھوٹے چھوٹے پرزے اٹھاتا، ادھوری سطریں پڑھتا اور ان کو پھاڑ کر پھینک دیتا۔ پھولوں کو سونگھتا۔ خالی بیاضوں پر نوک دار پنسلوں سے نقطے اور لکیریں بناتا اور ہزاروں دفعہ اپنے دستخط کرتا۔

لیکن جلد ہی اس کا یہ جنون بڑھنے لگا۔ ناقابل برداشت ہو گیا۔

میری پرانی بیاضوں سے نکلے ہوئے وہ کاغذ پورے گھر میں میرا پیچھا کرتے۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں نے اتنا کچھ لکھنا چاہا تھا۔ وہ ان کاغذ کے ٹکڑوں کو ان کتابوں کے اندر رکھ دیتا جن کو میں پڑھ رہا ہوتا، میرے بریف کیس میں، بستر کے قریب لیمپ پر، صبح کے اخبار کے نزدیک، چائے کی پیالی کے نیچے، ٹوتھ پیسٹ کے قریب، یہاں تک کہ جب میں اپنا بٹوا کھولتا تو کاغذ پھڑپھڑاتے ہوئے نیچے گرتے۔

میں انہیں پڑھتا، پھاڑتا اور پھینک دیتا۔

اب تک میں نے کوئی احتجاج نہ کیا تھا۔ میں تجسس میں گھر چکا تھا۔ میں پڑھنا چاہتا تھا کہ برسوں پہلے میرے ذہن میں کون سے خیالات موجزن تھے۔ اور پھر کبھی تو یہ کاغذ کے ٹکڑے ختم ہوتے ہی تھے۔ اتنا تو مجھے یقین تھا، یہ سلسلہ ایک نہ ایک دن ختم ہو جائے گا۔

رات گئے جب میں لحافوں کے بوجھ تلے لیٹا ہوتا، اس کے قدموں کی آواز آتی۔ وہ گھر میں گشت لگاتا، میری شکستہ تحریر لیے ننھے منے کاغذ ادھر ادھر اگاتا پھرتا۔ مڑے تڑے ایک دوسرے سے پیوست حروف، الفاظ کے نیچے کھنچی ہوئی موٹی موٹی سیاہ لکیریں۔

ہم دونوں نے معمول کے مطابق خاموشی برقرار رکھی۔ اور وہ روزانہ میرے پھاڑے ہوئے کاغذوں کے ننھے منے پرزے راکھ دانوں اور ردی کی ٹوکریوں سے چنتا رہا۔

سوائے اس کے کہ اب کاغذوں کی موجیں تھمتی جا رہی تھیں۔ ایک صبح میں نے پہلی میز پر ایک صفحہ پایا جس پر اس کے ہاتھ کی ایک سطر لکھی ہوئی تھی۔ اس نے میرے خط کی نقل

کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگلی صبح پھر خالی صفحے پر اس کے ہاتھ کی بھدی لکھائی۔

اور پھول، ہر کمرے میں۔۔۔

اور آسمان، بادلوں سے ڈھکا ہوا۔۔۔

میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں غصے سے پاگل ہو گیا، اور اس کے کمرے میں دندناتا ہوا پہنچا۔ وہ میز پر بیٹھا کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ وہی میرے خط کی نقل۔ میں نے بچی کھچی بیاضیں سمیٹیں اور عین اس کی آنکھوں کے سامنے پرزے پرزے کرنے لگا۔ میں نے گھر کے تمام گلدانوں سے پھول نوچ ڈالے اور دروازے پر ڈھیر کر دیے، اور اس کو حکم دیا کہ انہیں باہر پھینک کر آئے۔

"اب کھیل ختم ہوا"، میں نے اس سے کہا۔

اس نے پھول سمیٹے اور گھر کے قریب میدان میں دفن کرنے چل دیا، اور پھر واپس نہیں آیا۔ وہ تین دن گھر سے باہر رہا۔ دوسرے دن میں نے پورے شہر کی خاک چھان ڈالی۔ (اس اثنا میں گھر گرد سے اٹ گیا اور باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا انبار لگ گیا۔)

تیسرے دن سہ پہر کو وہ واپس لوٹا۔ دھوپ کی تمازت سے اس کا رنگ جل گیا تھا، اور اس کے کپڑوں میں مٹی کی خوشبو تھی۔

میں نے غصے کو قابو میں کیا اور اس کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا۔

وہ کہاں گیا تھا؟ کیا ہوا تھا؟ وہ گھر سے کیوں بھاگا تھا؟

وہ گھر کے قریب ایک میدان میں سوتا رہا تھا۔ جب میں گھر سے باہر نکلتا تو وہ چپکے سے اپنے کمرے میں آ کر چھپ جاتا۔ ایک دفعہ میں اچانک گھر آ گیا تھا اور وہ اپنے کمرے میں موجود تھا۔ لیکن مجھے علم نہ ہو سکا تھا۔ وہ کیوں بھاگ گیا تھا؟ وہ تسلّی بخش جواب نہ دے سکا۔ اس کا خیال تھا کہ میں چاہتا ہوں وہ میری نظروں سے دور ہو جائے۔ اس کا خیال تھا میں تنہائی میں نظمیں لکھنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ اسکول میں شاعروں کے بارے میں یہی بتایا گیا تھا۔ ان کی تنہائی کے بارے میں۔۔۔

وہ منحوس استاد۔

یا یہ سب اس کی مکاری تھی؟

اب وقت آ گیا ہے کہ میں اس کا فیصلہ کروں۔ وہ اب سرحد کے اس پار لڑکھڑانے لگا ہے۔

میں نے انتہائی صبر کے ساتھ اس سے دیر تک بات کی۔ تم اب کیا چاہتے ہو؟ میں نے اس سے کہا۔ مجھے جتنا کچھ لکھنا تھا، میں لکھ چکا۔ میں شاعری ترک کر چکا ہوں۔ آخر تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟

اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اور اس کے منہ سے شدت جذبات سے کچھ الفاظ نکلے جو میں بڑی مشکل سے سمجھ پایا۔ اس کا خیال تھا کہ میں دکھی ہوں، میں خوش نہیں ہوں۔

کاش اس لمحے تم نے اسے دیکھا ہوتا۔

Scanned with CamScanner

وہ ضعیف العقل لڑکا، خرد و جنوں کی سرحد پر کھڑا ہوا، اس کی عینک آہستہ آہستہ اس کی ناک پر پھسلتی ہوئی۔ لمبا تڑنگا، اٹھارہ برس کا۔

خزاں کی دھوپ شام کے وقت خراماں خراماں کمروں سے گزرتی ہوئی۔ برابر والے گھر سے موسیقی کی آواز۔ کوئی وائلن کے سروں کی مشق کر رہا ہے، ایک ہی مشق کئی دفعہ، اور ہر دفعہ بےسُری۔ ایک تار سے ہر دفعہ غمناک سی چیخ نکلتی ہے۔

اچانک مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا ہے۔ میں سوچ سکتا ہوں کہ باغ میں گھاس یوں ہی سرسراتی رہے گی۔

میں اس کو دیکھتا ہوں جیسا وہ حقیقتاً ہے؛ ایک نامکمل تخلیق۔

میں مسکراتا ہوں اور سرگوشی میں کہتا ہوں، "میں تھک گیا ہوں۔ غالباً تم میرے لیے لکھ سکتے ہو۔"

وہ سکتے میں رہ جاتا ہے۔ اپنی عینک اتارتا ہے اور اسے قمیص سے صاف کر کے دوبارہ پہنتا ہے۔

"میں نہیں لکھ سکتا"، وہ بھی سرگوشی کرتا ہے۔

اتنا کرب، یقیناً وہ نہیں لکھ سکتا۔ مجھے اب آزاد ہونا ہے۔ یہ زنجیریں توڑنی ہیں، یہ رشتے، یہ بندھن... برسوں کی اذیت۔ آدمی اس پر رو سکتا ہے۔ وہ سب مجھے اس کے ساتھ اکیلا چھوڑ گئے۔ اور پھر وہی بےسُری وائلن کی تان۔

"تم میری مدد کرو گے"، وہ آہستہ سے کہتا ہے، گویا ہم دونوں میں یاری ہے۔

"میں تمھاری کوئی مدد نہیں کروں گا۔"

مجھ پر گہری تھکان طاری ہو گئی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہوا، بیت اٹھایا اور باہر نکل آیا۔ دو دفعہ نوآموز موسیقار کے گھر کا چکر لگایا اور شہر کی طرف چل پڑا۔

رات کو جب میں واپس آیا تو وہ جا چکا تھا۔ مجھے پھر اپنا کھانا خود تیار کرنا پڑا۔ اور جب میں سلائس کاٹ رہا تھا تو چھری میرے ہاتھ سے پھسل گئی۔ کئی سال بعد خون بہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ گھر سے بھاگ گیا ہے۔ لیکن وہ آدھی رات کو واپس آ گیا۔ اس وقت میں اپنے کمرے کی بتی گل کر چکا تھا۔ وہ گھر میں ٹہلنے لگا۔ کمرے کو اپنے قدموں سے ناپتا، بالکل جیسے میں ٹہلا کرتا تھا، جب لفظوں کا دریا میرا اندر تلاطم برپا کرتا، الفاظ جب نظموں کی صورت باہر نکلنے کی کوشش کرتے۔

میں اس کے گشت کرنے کی آواز سنتے سنتے سو گیا۔

دوسرے دن اس نے اپنا کمرہ خالی کیا۔ اسکول کی کتابیں، انسائیکلوپیڈیا جو اسے تحفے میں ملے تھے، کاپیاں، ڈبے، تمام چیزیں باہر نکال دیں۔ نئے کاغذوں کے دستے اور چھلی ہوئی پنسلیں اپنی میز پر منتقل کر لیں۔

خزاں کے آنے سے آسمان پھیکا پڑ گیا تھا۔

میں ریٹائرمنٹ کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ رومانوی سے انداز میں۔ ملازمت چھوڑ دوں، گھر بیچ ڈالوں، پیسے سمیٹوں اور فرار ہوجاؤں، کہیں دور، کسی دور دراز مقام پر، کسی قدیم شکستہ بندرگاہ میں رہائش اختیار کرلوں، اور وہاں سے کسی بڑے شہر کی چھوٹی سی کھولی میں منتقل ہوجاؤں۔ مختصراً ارادے، حماقتیں۔ میں نے ٹریول ایجنسیوں کے چکر لگانا شروع کر دیے، اور رنگ برنگ کتابچوں سے لدا پھندا گھر پہنچنے لگا۔ گھر کے باہر باڑھ پر "برائے فروخت" کا تختہ لٹکا دیا۔

ہلکی سی بارش ہوئی۔

ایک جمعے کو میں اپنی بیٹیوں سے ملنے یروشلم گیا اور سبت کا دن وہاں گزارنے کا فیصلہ کیا۔

میرا بےحد گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ انھوں نے میرے اعزاز میں موم بتیاں جلائیں اور گھر کو پھولوں سے بھر دیا۔ نواسے نواسیاں میری چھڑی سے کھیلتے رہے۔ مجھے احساس ہوا اب تک میں ان لوگوں سے غفلت برتتا رہا تھا۔ کھانے کے وقت انھوں نےمجھے میز پر سب سے اہم جگہ بٹھایا۔

میں پوری شام اس کی باتیں کرتا رہا، کسی جنونی کی طرح۔ میں نے موضوع نہیں بدلا، کوئی اور بات کرنے پر تیار نہ ہوا۔ میں نے ان لوگوں سے اس کا حل طلب کیا، اصرار کیا کہ اسے کسی کام پر لگانا ضروری ہے۔ میں نے اعلان کیا میں ملک سے باہر جا رہا ہوں، دنیا کی سیر کرنے۔ اب کوئی اور اس کی ذمےداری اٹھائے۔ وہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ کسی کی بھی خدمت کر سکتا ہے۔ کچھ بھی کرے بس میں اب اس کی ذمےداری نہیں لے سکتا۔ اب مجھے آزادی چاہیے۔ اب وہ بالغ ہو چلا ہے۔

میں نے نظموں کے بارے میں ایک لفظ نہ کہا۔

پہلی بار میرے دامادوں نے مجھے بھرپور توجہ دی۔ لڑکیاں چکرا گئیں، پریشان ہوئیں۔ "تم دونوں کے درمیاں کیا ہوا ہے؟" ہم سب میز سے اٹھ گئے اور کافی پینے کے لیے آرام کرسیوں میں بیٹھ گئے۔ بچے لباس تبدیل کر کے شب بخیر کہنے آئے۔ ننھے منے ہاتھوں کو ہلاتے انھوں نے ایک شاعرہ کے دو مصرعے پڑھے، وہ شاعرہ جس کو مرے ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ پھر انھوں نے ہونٹوں سے میرا چہرہ گیلا کر دیا اور سونے کے لیے چلے گئے۔ میں اس کی باتیں کرتا رہا۔ میری توجہ ہٹانے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ وہ سب بےحد تھک چکے تھے۔ وہ اب صرف سر ہلا رہے تھے۔ وقتاً فوقتاً وہ ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھتے گویا میں پاگل ہو گیا ہوں۔

اور پھر وہ سب اچانک اٹھ کھڑے ہوئے، مجھ سے کچھ کہے بغیر۔ مجھے آہستگی سے پکڑ کر بستر تک لے گئے۔ مجھے بوسے دیے اور اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

تب مجھے پتا چلا پوری شام باہر طوفان امڈتا رہا تھا۔ ایک جواں سال درخت کی شاخیں

Scanned with CamScanner

بستر تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب میری آنکھ کھلی، برسو خاموشی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ آسمان صاف تھا، سوائے بادلوں کے چند ٹکڑوں کے۔ جواں سال درخت سورج کی طرف منہ کیے خاموش کھڑا تھا۔ صرف چند تنوے ہوے۔ چمکیلے پتّے کھڑکی کی منڈیر پر پڑے تھے۔

میں دوپہر میں گھر واپس چلا گیا۔ میرے دامادوں نے اس کے لیے ملازمت تلاش کرنے کا وعدہ کیا۔ میری بیٹیوں نے کسی نیم معطل ادارے کا تذکرہ کیا۔

سردیاں گویا زمین سے پھوٹ پڑی تھیں۔ سڑک اور فٹ پاتھ کے درمیان ننھے منے تالاب بن گئے تھے۔ میرا عکس بلکورے لیتا اور ہزار کرچیوں میں بکھر جاتا۔

وہ گھر پر نہیں تھا۔ اس کا کمرہ مقفل تھا۔ میں باہر باغ میں گیا اور کھڑکی سے اس کے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ کھڑکی کھلی تھی اور کمرہ بالکل صاف ستھرا تھا۔ سفید کاغذ اس کی میز پر چمک رہے تھے۔ ان پر یقیناً کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں واپس اندر آیا اور اس کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ دوبارہ باہر آیا اور ایک بڑا سا پتھر اس کی کھڑکی کے نیچے لڑھکا کر اس پر چڑھنے لگا۔ لیکن میری ٹانگیں کانپنے لگیں۔ میں بوڑھا ہو چلا تھا۔ اچانک میں نے سوچا "وہ میرا کیا لگتا ہے؟" میں اندر گیا، ٹائی بدلی اور دوستوں کی تلاش میں کیفے کی طرف چل پڑا۔

ہفتے کی رات - سڑکوں پر شوروغل۔ ہم کیفے کے ایک کونے میں جمع ہیں۔ بوڑھے، تلخ، فنکارا کوتوں میں لپٹے بجھے ہوے آتش فشاں۔ دھواں اگلتے ہوے۔ جھریوں بھرے ہاتھوں سے دنیا کو مسلتے ہوے۔ زمین سے منجمد کرنے والے بخارات اٹھ رہے ہیں اور کیفے کی شیشے کی دیوار دھندلا چکی ہے۔ میں کرسی میں بےسدھ پڑا ہوا ہوں۔ سگریٹ کا ٹکڑا انگلیوں میں دبائے، مرغولے بناتا ہوا۔ پتھریلے فرش پر چھڑی کو رقص دیتا ہوا۔ میں جانتا ہوں، یہ شہر ریت پر بنا ہے، گم سم اور دشوار گزار۔ مکانوں اور فٹ پاتھ کی پتلی سطح کے نیچے جلی ہوئی ریت کا ایک وسیع صحرا ہے۔

اچانک چند لمبے بالوں والے، غلیظ، لاابالی نوجوانوں کا ایک گروہ باہر گلی میں نمودار ہوتا ہے۔ ہم ان کو دیکھ کر بھویں چڑھاتے ہیں، ناکیں سکیڑتے ہیں۔ میرا بیٹا اس غول کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے رخسار تمتما رہے ہیں۔

وہ سب برابر والے کیفے کی خالی کرسیوں پر ڈھیر ہو جاتے ہیں۔ میرا لڑکا ان سے کچھ فاصلے پر ایک کرسی میں دبک گیا ہے۔ ان کے درمیان غل غپاڑے کی صورت میں کوئی گفتگو ہونے لگی ہے۔ میری نظریں اس پر جمی رہتی ہیں۔ کوئی اٹھتا ہے، جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالتا ہے اور ایک نظم پڑھنا شروع کرتا ہے۔ کوئی توجہ نہیں دے رہا، سوائے میرے بیٹے کے۔ وہ ایک ایک کے پاس آ کر رکتا ہے، اور پھر میرے لڑکے کے اوپر جھک جاتا ہے۔ کچھ لوگ ہنستے ہیں۔ کوئی جھک کر میرے بیٹے کے گالوں کو تھپتھپاتا ہے---

مجھے یقین ہے کسی کو اس کا نام نہیں معلوم۔ اور نہ اس کے باپ کا۔

ہوں، سیاہ سمندر کو دیکھتے۔ اور پھر گھر۔ میں صوفے پر لیٹ جاتا ہوں۔ اخبار اٹھاتا ہوں اور ورق گردانی کرنے لگتا ہوں۔ ادبی صفحے پر نظر ڈالتا ہوں۔ ایک نظم کی دو تین سطریں پڑھتا ہوں، افسانے کا ایک پیراگراف، اور رک جاتا ہوں۔ ادب مجھے بور کرتا ہے، رلا دینے کی حد تک۔ اور پھر میں سو جاتا ہوں، لباس تبدیل کیے بغیر۔ خواب دیکھتا ہوں کہ مجھے آپریشن کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔ مجھے سُن کرنے کا انجکشن دیا جا رہا ہے اور پھر میری چیرپھاڑ شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن مجھے درد کا کا احساس نہیں ہوتا۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ پھر بےہوشی۔ بےجان گوشت کے لوتھڑے کی طرح۔ تب میری سمجھ میں آتا ہے، میرے چہرے پر روشنی پڑ رہی ہے۔

میں سردی سے کپکپاتا ہوا اٹھتا ہوں۔ میرے کپڑوں پر شکنیں ہیں۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ میں باورچی خانے میں جاتا ہوں، کیتلی چڑھاتا ہوں اور پانی کے ابلنے کا انتظار کرتا ہوں۔ جھوٹے برتنوں کا انبار لگا ہوا ہے۔

ایک بڑی سی چھکڑا گاڑی، جس کی بتّیاں گل ہیں، ہماری تنگ گلی میں رینگتی ہوئی آتی ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے روشن کھمبے کے نیچے، بریک کی چرمراتی آواز کے ساتھ رکتی ہے۔ اندر سے شوروغل کی آوازیں آتی ہیں۔ پھر خاموشی کا ایک طویل وقفہ۔ ایک دروازہ کھلتا ہے اور کسی کو اتارا جاتا ہے۔ چہرہ زرد، حواس باختہ۔ یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کے نقوش ساکن ہیں۔ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ کا سایہ تک نہیں۔ ایک اور دروازہ کھلتا ہے، اور ایک شخص گھسٹ کر باہر نکلتا ہے، سڑک کے بیچوں بیچ، شراب کے نشے میں چور۔ وہ میرے لڑکے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کا ہاتھ تھامتا ہے اور جوش سے ہلا ہلا کر مصافحہ کرتا ہے۔ اور پھر کار میں واپس دھنس جاتا ہے۔

کار کے اندر مقیّد انسانی ہجوم کے چیخنے چلانے کی آوازیں۔ خاموشی کا ایک طویل وقفہ۔ پھر ایک جھٹکا اور گھڑگھڑاہٹ۔ اور اندھی، ٹوٹی پھوٹی گاڑی ایک کالے کچھوے کی طرح سرکتی ہوئی گلی سے باہر نکل جاتی ہے۔

میرا بیٹا کھمبے کے نیچے کھڑا ہے، عین اسی جگہ جہاں اس کو اتارا گیا تھا۔ کافی دیر تک وہ ساکت کھڑا رہتا ہے۔ اس کا جسم ہلکا سا آگے کو جھکا ہوا ہے۔ اچانک وہ دُہرا ہو جاتا ہے اور قے کرتا ہے۔ ہتھیلی سے منہ صاف کرتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا گھر کے اندر داخل ہوتا ہے۔ باورچی خانے کی طرف سے ہوتا ہوا گزرتا ہے، میری موجودگی سے بےخبر، اور اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیتا ہے۔ شراب کی مدھم سی بو ہال میں تیرنے لگتی ہے۔

سرما۔ بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ ہی یہ نشیبی علاقہ دلدل میں تبدیل ہونے کی سعی کرنے لگتا ہے۔

ایک بوڑھا شاعر، جو اب تقریباً اندھا ہو چلا ہے، جو مسلسل احمقانہ، ترحّم آمیز نظمیں چھپوا کر نوجوان شاعروں کے دل جیتنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے، سڑک پر مجھ سے ٹکراتا

Scanned with CamScanner

بالآخر آنکھ کے خفیف سے اشارے کے ساتھ مجھے اطلاع دیتا ہے کہ نوجوان فنکاروں کے ساتھ وہ میرے بیٹے سے بھی مل چکا ہے۔

"اچھا نوجوان ہے۔ کیا وہ لکھتا ہے؟"

چاروں طرف سے افواہیں مجھے گھیر لیتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے وہ اسے ستاتے ہیں، چھیڑتے ہیں۔ دوسروں کا خیال ہے کہ بگڑے ہوئے نوجوانوں نے خوشی کے ساتھ اس کو اپنے گروہ میں شامل کر رکھا ہے۔ انہیں روز روز تو ایک بیزبان احمق نہیں مل سکتا۔ اس کے علاوہ وہ ایک نوجوان شاعر کا منظور نظر بن چکا ہے، اور ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر کا چپراسی بھی۔

میں اس کو سخت الفاظ میں برا بھلا کہتا ہوں۔ لیکن وہ نہیں سنتا۔ خالی الذہن، اس کی آنکھیں بادلوں سے ڈھکی دنیا کا جائزہ لیتی ہیں۔ وہ مجھے دیکھتا تک نہیں۔ اس کا چہرہ چند ہفتوں میں کچھ زرد پڑ گیا ہے۔ اس کے بھدے، غبی نقوش میں ایک راہبانہ روحانی سی کیفیت پیدا ہو چکی ہے۔ مجھے معلوم ہے، اگر میں نے احتیاط نہ کی اور اگر میرے منہ سے کچھ نکل گیا تو وہ بھاگ جائے گا، پاگل ہو جائے گا، گلیوں میں آوارہ پھرے گا۔ مجھے بدنام کرے گا۔ پہلے ہی وہ گھر کو نظرانداز کرنے لگا ہے۔ وہ کھانا باہر کھاتا ہے۔ باغ ایک جھنکاڑ میں تبدیل ہو گیا ہے۔ میرا خیال تھا اسے پودوں سے محبت تھی۔

جب وہ گھر میں ہوتا ہے خود کو کمرے میں بند کر لیتا ہے اور کسی جنونی کی طرح لکھتا رہتا ہے۔ ہم نے اب تک اس کی ایک نظم بھی نہیں دیکھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ لکھتا ہے۔

میں ہال میں اس کو جا لیتا ہوں۔ اس کی آستین پکڑ کر کھینچتا ہوں اور طنز بھرے لہجے میں کہتا ہوں "محترم لکھتے ہیں! جی؟"

وہ میرے ہاتھ کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ میرا لہجہ اس کو پریشان کر دیتا ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور وہ مجھے خوف بھری نظروں سے دیکھتا ہے گویا میں لاعلاج ہوں۔

اس میں گھنٹوں اپنے کمرے میں بند ہو کر توجہ مرکوز رکھنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے۔ کبھی کبھار وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے، کتابوں کی الماری کی طرف جاتا ہے، نظموں کا کوئی مجموعہ اٹھاتا ہے اور گھنٹوں اس میں سر دیے کھڑا رہتا ہے۔ اس کا قاعدہ ہے کہ وہ صفحہ نہیں پلٹتا۔ پھر وہ خاموشی سے کتاب واپس رکھ کر کمرے سے نکل جاتا ہے۔ پچھلے دنوں سے وہ لغت استعمال کرنے لگا ہے۔ وہ اکثر لغت کھول کر دیر تک اندھوں کی طرح اس کے صفحے الٹتا پلٹتا ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اسے لغت کا استعمال آتا ہو گا۔

آخر مجھ سے رہا نہیں جاتا۔ میں اس سے پوچھتا ہوں وہ کون سا لفظ تلاش کر رہا ہے۔

وہ جاننا چاہتا ہے کہ آسمان کو کس طرح لکھا جاتا ہے۔

"آسمان؟"

"لفظ، آسمان..."

جاتا ہے۔"

اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اسی طرح خوفناک حد تک سنجیدہ صورت لیے کھڑا ہے۔

"س سے یا ث سے؟" وہ سرگوشی کرتا ہے۔

"ث سے؟" میں غصے سے دہاڑتا ہوں۔ "ث سے کیوں؟"

وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگتا ہے۔

"اور پھر تمہیں آسمان سے کیا کرنا ہے آخر...؟"

وہ کوئی جواب نہیں دیتا۔ آہستگی سے لغت بند کرتا ہے اور اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد وہ پھر دبے پاؤں کمرے میں داخل ہو کر لغت اٹھاتا ہے اور تلاش شروع کر دیتا ہے۔ میں چونک پڑتا ہوں۔

"اب کیا؟"

"آزادی..." وہ ہکلاتا ہے۔

"آزادی؟ کیا مطلب؟"

"ز سے یا د سے؟"

ایک بار پھر وہی ناقابلِ فہم طیش کی لہر۔ اس لیے اور بھی کہ خود میں گڑبڑا رہا ہوں کہ آزادی کیسے لکھا جاتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ سے لغت چھینتا ہوں اور جنونی کیفیت میں لفظ تلاش کرنے لگتا ہوں۔

اسی دوران میرے ریٹائرمنٹ کے منصوبے کی تیاری ہو رہی ہے۔ وقتاً فوقتاً لوگ گھر دیکھنے آتے ہیں جو کہ میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔ میں انہیں سارے کمرے دکھاتا ہوں، ان کو ہر کونے کھدرے میں جھانکنے کی اجازت دیتا ہوں، نیچے تہہ خانے میں لے جاتا ہوں، احاطے کے گرد، باغ میں اور بالکنی کے پیچھے لے جاتا ہوں، دھیمی آواز میں اس مکان کی خصوصیات گنواتا ہوں جس میں میں نے تیس سال گزارے ہیں، اور پھر سردمہری سے مکان کی قیمت بتاتا ہوں۔ میں ان کے نام پوچھتا ہوں اور جواب میں اپنا نام بتاتا ہوں۔ وہ کاغذ پر جھک کر میرا نام لکھتے ہیں، ایک نام جو ان کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ ان کے چہروں پر اس نام سے مانوسیت کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ کیا انہوں نے اپنی زندگی میں آج تک شاعری نہیں پڑھی؟ غالباً میں اس خطے سے گمنام ہی اٹھ جاؤں گا۔

گاہکوں کو البتہ باغ دیکھ کر شدید مایوسی ہوتی ہے۔ خودرو جھاڑیاں اور کیچڑ۔ میرا لڑکا بیلچا اٹھانے سے قطعی انکاری ہے۔ آخر خود ہی باغبانی کے اوزار اٹھاتا ہوں اور ہر روز جھاڑیاں اکھاڑتا ہوں۔

آفس میں میرے لیے الوداعی پارٹی۔ تمام لوگ چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے، شام چار بجے، اکٹھے ہوئے۔ کیک پیش کیے گئے اور جام بلند ہوئے۔ کافی دیر تک میری خدمات کو سراہا گیا۔ بعضوں کی آنکھوں میں میں نے آنسو بھی دیکھے۔ کسی نے میری شاعری کا تذکرہ نہیں کیا، گویا

Scanned with CamScanner

میرے احساسات کو مجروح کرنا نہ چاہتے ہوں۔ اور تقریب کے اختتام پر ایک الوداعی تحفہ، ایک پینٹنگ، مٹیالا سمندر۔۔۔

میں اپنا سامان باندھتا ہوں۔ کتابوں کے سامنے تذبذب میں کھڑا ہوں۔ کسے ساتھ رکھوں، کسے چھوڑ جاؤں۔ میں اپنے دامادوں کو لڑکے کے مستقبل کے بارے میں تاکیدی خطوط ارسال کرتا ہوں۔ میں فوی پر ان سے بات کرتا ہوں اور اصرار کرتا ہوں کہ کچھ کریں۔ بالآخر وہ مجھے ایک دن شہر کے ایک چھوٹے سے کیفے میں ملاقات کا وقت دیتے ہیں۔ میز کے گرد بیٹھ کر وہ مجھے اپنا منصوبہ بتاتے ہیں۔ انھوں نے معلومات کروائی ہیں۔ اور یروشلم کے نزدیک ایک بوڑھے جلد ساز نے لڑکے کو جلدسازی سکھانے کے لیے آمادگی کا اظہار کیا ہے۔ لڑکے کے کھانے پینے اور رہنے کا انتظام بھی وہیں ہو گا۔ بوڑھے جلدساز کا ایک ایسا ہی بیٹا تھا جو کسی بیماری میں چل بسا۔ البتہ اس نے ایک شرط رکھی ہے؛ اگر لڑکا بیمار ہو جائے، مثلاً اگر اسے مرگی کے دورے پڑنے لگیں، یا کچھ اور۔۔۔ تو اس کو فوراً واپس لیا ہو گا۔ وہ لوگ ایسی صورت میں اس کی دیکھ بھال اور تیمارداری کا ذمہ ہرگز نہیں لے سکتے۔

لہذا میرے دامادوں نے مزید کھوج کے بعد ایک ایسی بوڑھی عورت تلاش کر لی ہے جو جلد ساز کے گھر کے قریب ہی رہتی ہے۔ وہ لڑکے کو بیماری کی حالت میں قبول کرنے کو تیار ہے۔ ظاہر ہے کچھ پیسوں کے عوض۔ اور بس۔ مجھے صرف ان دونوں انتظامات کے کاغذات پر رضامندی کے دستخط کرنے ہیں۔

وہ کاغذات نکالتے ہیں۔

میں فوراً دستخط کرتا ہوں۔ لیکن میں غصے سے آگ بگولا ہو رہا ہوں۔

"جہاں تک مرگی کے دورے وغیرہ کا تعلق ہے، تم لوگوں کا تردد بےمعنی ہے۔ تمھیں معلوم ہے وہ ان میں سے نہیں ہے۔ وہ بورڈرلائن کیس ہے۔ میں نے یہ ہزار دفعہ بتایا ہے۔ لیکن تم لوگ سمجھتے ہی نہیں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔"

میرے داماد کاغذات سمیٹتے ہیں اور نقل میرے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ کافی کے آخری گھونٹ چڑھاتے ہیں اور شفقت آمیز مسکراہٹ سے مجھے دیکھتے ہیں۔

"دیکھا آپ نے۔ آپ سمجھتے تھے ہم آپ کا خیال نہیں رکھتے۔۔۔"

دوسرے دن میں پھر کاغذات پر دستخط کرتا ہوں۔ اس دفعہ مکان کی فروخت کے کاغذات پر۔ مجھے ایک مناسب گاہک مل ہی گیا۔ بہرحال مکان بیچ کے مجھے اچھی خاصی رقم مل گئی ہے جو کہ صرف زمین کی قیمت ہے۔ مکان کو مسمار کر دیا جائے گا۔

گھر کی اشیا مکان کی قیمت میں شامل تھیں۔ تین مزدور شام کو آئے اور گھر خالی کرنا شروع کر دیا۔ تمام چیزیں چلی گئیں سوائے دو عدد گدّوں کے۔ انھوں نے وہ میز تک اٹھا لی جس پر وہ بیٹھ کر لکھ رہا تھا۔ وہ غصے سے پاگل ہو گیا۔ کاغذوں کو بازوؤں میں سمیٹے وہ خالی مکان میں بھٹکتا رہا۔ چند کاغذات پھسل کر فرش پر گر گئے اور ایک مزدور نے انھیں اٹھا کر لیمپ ان میں لپیٹنا شروع کر دیا۔ وہ اپنے بھاری بھرکم ڈیل ڈول کے ساتھ مزدور پر پل پڑا،

اور اس کو دانت سے کاٹنے کی کوشش کی۔

مجھے احساس ہوا کہ شام کے وقت اس کے حواس بالکل کند ہو جاتے ہیں۔

نوٹوں سے میری درازیں بھر گئی ہیں۔ گو کہ مجھے جائداد کی اصل قیمت کا ایک چوتھائی ہی ملا ہے لیکن پھر بھی نوٹوں کے انبار لگ گئے ہیں۔ میں سب کچھ بیچ دینا چاہتا ہوں۔ اور جو نہیں بیچ سکتا، اسے بانٹ دیتا ہوں۔ کتابوں کے انبار میں زبردستی دوستوں کے گھر پہنچاتا رہا ہوں۔ اگر میرے لڑکے کو ذرا بھی فرصت ہوتی تو شاید وہ میری نکالی ہوئی چیزیں ردّی میں بیچ دیتا۔

ہم تہہ خانے کے پھیرے لگاتے ہیں اور پرانے کپڑے، جھاڑوئیں، مزید کتابیں، مسودے -- میرے اپنے اور دوسروں کے -- بےکار، فضول اشیا، ٹوٹی پھوٹی چیزیں نکالتے ہیں۔ تہہ خانے کے زینے پر تیس دن تک گردوغبار کا طوفان سا چھایا رہتا ہے۔

کیفے میں، میں اپنے دوستوں سے کہتا ہوں، "دیکھو، اس طرح آزاد ہوا جاتا ہے بندھنوں سے۔۔۔"

ساتھ ساتھ، میں باقاعدگی سے شہر کی چھوٹی سی بندرگاہ پر روز جاتا ہوں تاکہ سیاحت کے شوق کو ہوا دے سکوں، جہاں گردی کی چنگاری سلگا سکوں۔ اوور کوٹ پہنے، چھتری ہاتھ میں لیے، میں کرینوں کے درمیان گھومتا پھرتا ہوں، نمک اور زنگ کی بُو سونگھتا، جہازیوں سے بات چیت کرنے کی کوشش کرتا۔ میں ابھی تک یہ سوچ رہا ہوں کہ کہاں جاؤں۔ پہلے میں نے سوچا تھا یوروپ میری منزل ہو گا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ یونانی جزیروں پر جا کر رہ جاؤں۔ میری ایک ترک جہاز کے کپتان سے باسفورس کے سفر کی بات چیت چل رہی تھی کہ اس اثنا میں میں نے ایک احمقانہ قیمت پر قبرص تک آنے جانے کا جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ میں نے جہاز میں چڑھ کر اپنی ہونے والی کیبن کے دروازے کو چھڑی سے تھپتھپایا۔

یہ سفر میری جہاں گردی کا نقطہ آغاز ہو گا۔ اس کے بعد کوئی اور سفر، کوئی اور منزل۔

میرا بیٹا مسلسل لکھتا رہتا ہے۔ کھڑے کھڑے، گویا عبادت میں مصروف ہو۔ اس کے کاغذ کھڑکی کی منڈیر پر بکھرے رہتے ہیں، جس کو وہ میز کے طور پر استعمال کر رہا ہے۔ کاغذوں کے قریب ایک چھوٹی سی لغت رکھی رہتی ہے جس کو اس نے اس تمام ہنگامے میں کسی طرح بچا لیا ہے۔ میں جب اس کا بھولا دیکھتا ہوں مجھے خیال آتا ہے، یہ جیسا بھی ہے، کسی عورت کے ساتھ سو سکتا ہے۔ اور کیا معلوم؟ ہو سکتا ہے وہ یہ کر بھی چکا ہو۔ اس نے اب تک میری ریٹائرمنٹ کی حقیقت کو نہیں سمجھا ہے، میری متوقع روانگی کو۔ وہ اپنے مشغلے میں مصروف ہے۔ ایک دوپہر میں نے بڑی مشکلوں سے اسے اس جنوں سے نکالا اور اپنے ساتھ بوڑھے جلدساز سے ملاقات کرانے یروشلم لے گیا۔

وہ سردیوں کا ایک لطیف سا دن تھا۔ بادل چھائے ہوئے تھے لیکن بارش نہیں ہو رہی تھی۔ یروشلم کے بس اسٹیشن پر بوڑھا جلدساز سامان ڈھونے والے پرانے، چھوٹے سے ٹرک میں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ ٹرک کے پچھلے حصے میں جلد کے بغیر کتابوں کے انبار بچکولے کھا رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

وہ ہمیں شہر کے مضافات میں لے گیا۔ درختوں سے لدی پہنڈی وادی کے دامن میں، سرحد کے قریب کی آبادی میں اس کا گھر تھا۔ اس نے خاموشی سے ہمیں گھر میں داخل ہونے کا اشارہ کیا اور اس کی بیوی نے خاموشی سے ہمارا استقبال کیا۔ چائے اور کیک سے ہماری تواضع کی گئی اور ہمیں کھانے کی میز کے گرد بٹھایا گیا۔

میں ان لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوا۔ انھوں نے نہایت غور سے میرے بیٹے کا جائزہ لیا۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے لیکن ان دونوں نے اطمینان کا سانس ضرور لیا۔ غالباً وہ بدتر حالات کی توقع کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ ہمارے درمیان بات چیت کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ جلدساز میرے نام سے واقف تھا اور اسے یقین تھا کہ اس نے میری کوئی تحریر پڑھ رکھی تھی (گو نہ معلوم کیوں اس کا خیال تھا کہ میں نثر نگار ہوں) لیکن یہ بیس برس پہلے کی بات تھی۔

سچ تو یہ ہے کہ میں بےحد ممنون تھا۔ باہر ہوا سرسرا رہی تھی۔ میز پر رکھے سماوار میں چائے جوش کھا رہی تھی (عجیب و غریب قدیم عادتیں!) جلدساز کے گھر کے باغ میں ایک پرانا درخت بھی تھا، ہمارے درخت سے زیادہ بوڑھا اور پھیلا ہوا۔ اسکا تنا گٹھیلا اور کوہ دار تھا۔ سردیوں کی شفق کھڑکی سے پرے پھیکی پڑ رہی تھی۔ سرمئی آسمان میں ڈوبتے سورج کے شعلے لپک رہے تھے۔ دو وقتوں کی ملتی ہوئی سرحدیں۔ وہ میرے برابر بےحس بیٹھا تھا، بھاری ڈیل ڈول کا نوبالغ لڑکا۔ چائے کا بھرا ہوا پیالا اس کے سامنے جوں کا توں رکھا تھا۔ کیک کو اس نے ہاتھ تک نہ لگایا تھا۔ وہ جھکا ہوا بیٹھا تھا، اس کی نظریں اندھیری ہوتی کھڑکی پر جمی تھیں۔ وہ ہماری گفتگو نہیں سن رہا تھا، اپنی ہی دنیا میں گم تھا۔ اچانک وہ اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالتا ہے۔ الفاظ سے سیاہ کاغذ۔ وہ اس کو کھول کر اپنے سامنے رکھتا ہے، اس پر ایک لفظ لکھتا ہے اور تہہ کر کے دوبارہ رکھ لیتا ہے۔

ہماری گفتگو تھم جاتی ہے۔ بوڑھا جلدساز اور اس کی بیوی اس کو حیرت سے دیکھنے لگتے ہیں۔

"یہ لکھتا ہے..." میں مسکرانے کی کوشش کرتا ہوں۔

ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

"یہ شاعر ہے..."

"شاعر..." وہ سرگوشی میں دہراتے ہیں۔

اسی لمحے باہر بارش شروع ہو گئی۔ شام کی نارنجی روشنی کمرے میں بھر گئی۔ وہ کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا۔ لگتا تھا جیسے اس کے بالوں سے شعلے اٹھ رہے ہوں۔

وہ مجھے غیریقینی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اور وہ، قلم اس کی انگلیوں میں پھنستا ہوا، سب پر خاموش گمبھیر نظر ڈالتا ہے۔

"یہ نظموں کا مجموعہ چھپوائے گا۔ تم اس کی جلد بنا سکتے ہو..." میں جلدساز سے کہتا ہوں۔

جلدساز کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا میں اس کا مذاق اڑا رہا ہوں؟ بالآخر ایک شک میں لپٹی ہوئی مسکراہٹ اس کے چہرے پر پھیل جاتی ہے۔

"یقیناً اس کی کتاب چھپے گی۔ ہم اس کی جلد بنائیں گے..."

"مفت میں؟" میں چھیڑتا ہوں۔

"ہاں، مفت میں..."

میں اٹھتا ہوں۔

"ٹھیک ہے، وعدہ رہا۔ سنا تم نے..." میں اس سے مخاطب ہوتا ہوں۔

اس نے نہیں سنا۔

(باہر نکلنے سے پہلے جلدساز اور اس کی بیوی مجھے ایک کونے میں لے گئے اور یاد دلایا کہ لڑکے کی بیماری کی صورت میں وہ اس کے ذمےدار نہ ہوں گے۔ میں نے انھیں تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہو گی اور یہ کہ اس صورت میں انتظام کر لیا گیا ہے۔)

ہم باہر نکل آئے۔ جلدساز ہمیں بس اسٹیشن تک نہ چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اس کے ٹرک کی بتّی خراب تھی۔ ہم نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا، اور خاموش، برستے ہوئے آسمان کے نیچے سڑک پر چلنے لگے۔ وہ قطعی بےحسی کی حالت میں تھا۔ وہ کولتار کی سڑک پر اپنے پیر گھسیٹتا ہوا چل رہا تھا۔ ہم بس اسٹیشن پر پہنچے اور اسٹینڈ کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ ہمارے اطراف زیرِ تعمیر رہائشی عمارتیں تھیں، ننگی چٹانیں اور خاکستر زمین۔ شہر اور ویرانے کا ملاپ۔ یروشلم کی اداس ترین صورت، ہمیشہ برباد۔ یروشلم کو جتنا بھی تعمیر کیا جائے، اس کی تباہی کی یاد باقی رہے گی۔

میں اس کی طرف مڑا اور میرے منہ سے صاف اور واضح الفاظ نکلے:

"جلدساز اور اس کی بیوی بہت اچھے لوگ ہیں۔ لیکن تمھیں ان کے ساتھ تمیز کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔"

وہ خاموش رہا۔ ایک سائیکل سوار قریب سے گزرا۔ اس کی نظر لڑکے پر پڑی اور اس نے چہرہ فوراً موڑ لیا۔

اب بالکل اندھیرا تھا۔ رہائشی علاقوں میں بتّیاں ایک ایک کر کے روشن ہو رہی تھیں۔ ہم دونوں شیڈ کے نیچے تنہا کھڑے تھے۔ اچانک میں نے کہا، "میں نے اس صفحے پر نظر ڈالی تھی۔ اس میں ایک نظم لکھی ہوئی تھی۔ دیکھا تم نے، تم خود سے لکھ سکتے ہو۔ تمھیں میری ضرورت نہیں ہے..."

اس نے نظریں اٹھا کر مجھے دیکھا اور خاموش رہا۔

میں اس کے قریب ہو گیا، بہت قریب۔

"مجھے وہ نظم دکھاؤ۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

Scanned with CamScanner

"نہیں نہیں۔ میں نہیں پھاڑوں گا۔"

اور میں نے کاغذ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لیکن وہ پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے زبردستی اس سے کاغذ لینے کی کوشش کی لیکن وہ مدافعت کرنے لگا۔ اس دفعہ وہ مجھے یقیناً مار سکتا تھا۔

ایک اور سائیکل قریب سے گزری۔ دور سے آتی ہوئی بس کی آواز سنائی دی۔

یہ اس کی نظم کے بارے میں ہماری آخری بات چیت تھی۔

مجھے معلوم نہ تھا۔

یہ تین دن پہلے کی بات تھی۔

یہ موسم کتنا جان لیوا ہے۔ کھڑکیوں پر برف کے ذرّے چمٹے رہتے ہیں یا دھند جمی رہتی ہے۔ اس سے شدید سردی پہلے کبھی نہیں پڑی۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی سرمئی دھند، رات اور دن، صبح کے وقت مزید گہری ہوتی ہوئی۔ یہ آئینے میں کون ہے؟ میں، اب تک۔ ایک دراڑ پڑے پتھر کی طرح۔ صرف آنکھیں نمایاں ہیں، چمکتی ہوئی، حیرت انگیز طور پر زندہ۔

میں اب رخصت ہونے والا ہوں۔ ایک کشتی نکل چکی ہے۔ اس پر میں سوار نہ ہو پایا۔ دوسری کشتی میری منتظر ہے۔ مجھے صرف ضروری اشیا سوٹ کیس میں ٹھونسنی ہیں، تولیے تہہ کرنے ہیں، رقم اٹھانی ہے اور چل پڑنا ہے۔ ہمیں ان دو کمروں پر گزارا کرتے ہوئے اب دو ہفتے سے زائد ہو چلے ہیں۔ نیا مالک مکان روز آتا ہے اور ہمیں وہیں پاتا ہے۔ اب اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹنے ہی والا ہے۔ وہ میرے گرد منڈلاتا رہتا ہے، اس انتظار میں کہ اب میں اپنا بوریا بستر باندھ کر رخصت ہو جاؤں۔ کل اس نے دھمکی بھی دی کہ وہ مجھ پر مقدمہ کر دے گا۔ اس نے اس مکان پر زندگی بھر کی جمع پونجی لگا دی ہے۔ اس کے بھی کچھ خواب ہیں۔

بس اب مجھے اپنا بوریابستر واقعی سمیٹنا ہے۔ لڑکے کو بوڑھے جلدساز کے پاس پروشلم روانہ کرنا ہے جو اس کا سرحد کے قریب انتظار کر رہا ہے۔ اب اس کو مزید الٹوا میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ کیونکہ لڑکے نے روز رات کو آوارہ گردی شروع کر دی ہے۔ اس نے لکھنا بند کر دیا ہے۔ کل میں نے آدھی رات تک اس کا انتظار کیا لیکن وہ اس وقت تک نہ لوٹا تھا۔ وہ پوپھٹے کے قریب واپس آیا۔ اس کے قدموں کی آہٹ سے میری آنکھ کھلی۔

بالکنی کا دروازہ میرے ہاتھوں کے نیچے چرچراتا ہے۔ فرش گیلا ہے۔ اس پر ٹوٹے ہوئے پتّے اور ٹہنیاں بکھری ہوئی ہیں، گئے طوفان کے نشانات۔ آسمان سرد اور بےامید ہے۔ ہلکی ہلکی بارش اور صبح کی روشنی۔ یہ وسیع اور مانوس کائنات میرے سامنے یوں خاموشی سے قطرہ قطرہ ٹپکتی ہوئی۔ درخت کے پتے سرسراتے ہوئے۔

کیا میرے اندر لکھنے کی کوئی خواہش نہ رہی تھی؟ کیا میرا جی نہ چاہتا تھا کہ کچھ کہوں؟ لیکن کہنے کے لیے اب کیا باقی رہا تھا۔ میں بتاتا ہوں، یہ سب ایک دھوکا ہے، مایا ہے۔

پڑ گئے ہیں، پتھروں پر کائی جم رہی ہے۔

ایک سست رو تیر کی مانند آسمان کی جانب اٹھ جانا۔ روشی کے گالوں جیسے بادلوں میں لیٹ جانا۔ واپس زمین پر اترنا اور بےتغیر نیلاہٹ کو تکتے رہنا۔

میں شاعر ہوں جسے شاعری سے چھٹی مل گئی ہے۔ اب بارش ہو رہی ہے۔ قطرے میرے اوپر گر رہے ہیں۔ میں واپس اندر جاتا ہوں۔ مکان میں ایک اداس سی خاموشی چھائی ہوئی ہے، خرانوں کی مدھم آواز اس میں تیر رہی ہے۔ میں اوپر اس کے کمرے میں جاتا ہوں، میرا گاؤن زمین پر گھسٹتا ہوا، میرا بھاری سایہ بند دروازوں پر پڑتا ہوا۔

وہ فرش پر بچھے گدّے پر سو رہا ہے۔ فرش پر رکھا ایک چھوٹا سا لیمپ اس کے سرہانے روشن ہے۔ وہ اب تک بغیر اس ابدی روشنی کے نہیں سو سکتا۔ کھڑکی پہ پڑی چق سے صبح کی روشنی چھن چھن کے اندر آ رہی ہے۔

میں خاموشی سے اپنے قدموں میں اس کو سوتا ہوا دیکھتا ہوں۔ جب واپس جانے کے لیے مڑتا ہوں تو اچانک میری نظر اخبار کے چند صفحوں پر پڑتی ہے جو اس کے گدے کے پاس فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ مجھ پر دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ میں فوراً جھک کر صفحے اٹھاتا ہوں۔ صفحے اب تک نم ہیں۔ ان کی سیاہی میری انگلیوں پر اتر آتی ہے۔ میں کھڑکی کے قریب جاتا ہوں جہاں صبح کی ہلکی سی روشنی ہے۔

کسی فضول سے ہفت وار اخبار کا ضمیمہ ہے۔ اور تاریخ۔۔۔ تاریخ آج کے دن کی ہے، دن جو ابھی شروع ہونے والا ہے۔ میں بےجان ہاتھوں سے صفحے پلٹتا ہوں۔ ایک صفحے کے حاشیے کے قریب ایک پاگل پنے کی نظم، بغیر آہنگ کے، سطریں جو اچانک ختم ہو جاتی ہیں، بہکانے والی تکرار، بےطور اوقاف۔

اچانک خاموشی گہری ہو جاتی ہے۔ اس کی سانسوں کی آواز رک گئی ہے۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے، بوجھل، سرخ، نیند میں ڈوبی آنکھیں ۔ اس کے ہاتھ گدے کے قریب رکھی ہوئی عینک کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ عینک پہنتا ہے اور کھڑکی کی طرف مجھے دیکھتا ہے۔ ایک نرم، دل ربا، کچھ اداس سی مسکراہٹ اس کے چہرے کو جگمگا دیتی ہے۔

اب میری نظر پڑتی ہے۔ وہ میرا نام ہے جو نظم کے اوپر شکستہ خط میں لکھا ہوا ہے۔

○○○○○○

(عبرانی)

انگریزی سے ترجمہ : زینت حسام

Scanned with CamScanner

صلاح الدین محمود

ہم

اب تم خاک ہو مگر کبھی ایک بچے تھے
ک جس کا ایک ڈھلتی دوپہر
س کے باپ نے انتظار کیا تھا
مگر تم واپس نہ آ سکے تھے
اور وہ خاک ہو گیا تھا
تم اب تو خاک ہو، خاک میں ہو
مگر کبھی تمھارے دوہرے، نازک
ننگے تلووں نے پہلی بار
اس ہی خاک کو چھُو کر
اس جہاں کا مزہ
اپنی زباں پر پایا تھا،
اور س ہی لمحے
دور زمیں کے خم سے ابھر کر
پہلی بار
سیاہ گھوڑوں کا ایک تیز رفتار جھُنڈ
تمھاری جانب، تمھارے ننھے بدن کی جانب
بہتے پانیوں کا ایماں لایا تھا
وہ گھوڑے بھی اب خاک ہیں
اور تم بھی خاک ہو

[illegible]
ک جن کو اگتا دیکھ دیکھ کر
تم جواں ہوئے تھے
ور جن کے دائرے کے درمیاں
ایک مکمل رات، دور سے
ایک پیلے شعلے کو تم نے
ان درختوں کے غیب کی طرح
روشن پایا تھا
اس ہی شعلے کو تم نے مرتے وقت بھی یاد کیا تھا
بس یہ شعلہ ابھی تک خاک نہیں ہوا ہے
اور ابھی تک تمھارے بیٹے کے سائے میں
جلتا ہے
مگر اب وہ بیٹا
تمھارے بچپن کو یاد کرتے کرتے
خود خاک ہونے کو ہے

ابھی ابھی

ابھی ابھی
میں وہاں تھا کہ جہاں
رات کی رنگت میں مہک
تمھارے لب کی تھی

ابھی ابھی
میں وہاں تھا کہ جہاں
چاند کی جنبش میں عیاں
اپنی آنکھوں میں ہواؤں
کا گماں لیکر تم
اپنے اندر روشن
ایک میداں سے گزر کر باہر

Scanned with CamScanner

کو جانب
گردان تھیں

ابھی ابھی
اپنی آنکھوں کی سیاہی کی طرح
میں بھی وہاں تھا کہ جہاں
تم نے مجھے پایا تھا
چُھو کے مجھے جایا تھا

ابھی ابھی
میں وہاں تھا کہ جہاں
اک سیاہی کا نگندہ تھا جہاں
نور کی لَس میں عیاں
اور مخفی
پاس پانی کی کمک کا تھا گماں
اجلا جہاں
میری آمد کے شجر سے چھن کر
تنہا میداں میں کبھی
تم کو چھپاتا تھا کبھی
پاتا تھا

ابھی ابھی
میں وہاں تھا کہ جہاں
تم نے مجھے پایا تھا
چُھو کے مجھے جایا تھا

آج جہاں
دن کی لکنت کے سوا
کچھ بھی نہیں
ایک یکساں روشن
تنہا میداں کے سوا
کچھ بھی نہیں

ابھی ابھی
میں کہاں تھا کہ جہاں
تم بھی نہیں
میں بھی تھا

غیب کا عنقا پانی

موت نہ مٹی نہ پانی
نہ ہونٹوں کی ویرانی
موت نہ باطن نہ ظاہر
نہ غیب میں گم حیرانی
موت نہ لمحہ نہ بازو
نہ تلووں کی نم ساعت
موت نہ پوروں سے ٹپکی
شبنم کی اجلی راحت
موت نہ دوہرے ہاتھوں میں
دوہرے سینے کی جاں
موت نہ ننگے نم جسموں تک
قدموں کی پہچاں
موت نہ تھمتی آوازوں میں
نہ بالک کے لب میں
موت نہ میرے چہرے میں
نہ آئینے کی شب میں
موت نہ میری جاں کے بھیتر
باہر ایک پرندہ
موت نہ ہر رنگت کے اندر
رنگت ہی کر زندہ
موت نہ میری تنہا جنبش
نہ میری بینائی
موت نہ میرے ہونٹوں تک

rekhta

Scanned with CamScanner

بارش میں گھل کر آئی
موت تو اس عنقا پانی میں
جس میں میری جان تھی
موت تو اس دوہری ساعت میں
دوہری جس کی چھان تھی

مَیں

تم بالکل ایسی تھیں جیسے
پچھلے جنم میں مَیں تھا
ہونٹ تمہارے مجھ سے نم تھے
لمس کی خصلت مَیں تھا

پچھلے جنم میں مَیں نے تم کو
خواب پرے دیکھا تھا
آج تمہاری دونوں آنکھوں
کی رنگت میں مَیں تھا

ہوا محض تم کو جانتے تھی
سانس کو پہچانتے تھی
نیند پرے سانسوں کے بیچ میں
شب کی صورت مَیں تھا

ایک شجر تھا پہلے جیسا
سورج بھی پہلا سا
چھاؤں کے بھیتر تم ہنستی تھیں
چھاؤں کے باہر مَیں تھا

چاند کی ساعت تم بولی تھیں
چھاؤں کے دروازے سے

رات کے جنگل میں ایک تنہا
تنہا جنبش میں تھا

ایک جنم بیتا مٹی کو
پھر سے پانی بنتے
بارش کی بوندوں کے اندر
مٹی جیسا مَیں تھا

نظم

روکو پھول کو کھلنے سے
طائر کو ذرّہ
خاک کو پانی
پانی کو پھر پہلی بارش
بارش کو شفّاف سمندر
بننے سے
روکو ہوا کو مرنے سے
انسانوں جیسی
اک خلقت کو
ہوا کے اندر دم بھر کو
جنگل میں آگ کو جلنے سے
روکو رات کو دھیمے دھیمے
آگ کی جانب چلنے سے
تاریکی کو تاریکی سے
چھن کر سورج بننے سے
روکو
روکو شجر کو روکو
ہر آہٹ پر
طائر بن کر پھلنے سے
روکو میرے بدن کو گھل کر

rekhta

Scanned with CamScanner

چاند کو میری
شنوائی میں
ذرّہ ذرّہ ڈھلنے سے
روکو بیج کو مٹّی میں
جل کو آنکھوں میں
لمس کو لب پر
تنہائی میں پلنے سے
روکو میرے بدن کو روکو
ساعت ساعت گلنے سے
رنگو ہوا کو اب بھی روکو

فہمیدہ ریاض

مردمکِ چشمِ من

مردمکِ چشمِ من!
آ مری انگشت پکڑ
آ کہ چلیں سیر کو
فصلِ بہاراں ہے، تُو دیدِ بہاراں کر

یہ ہے مرے دل کی زمیں
کس قدر شاداب و حسیں
محرمِ مادر بسروچشم یہاں کی سیر کر
ساعتِ چند پیشتر
آئی تھی آندھی یہاں
ہر طرف غبار تھا
آیا پھر سیلابِ اشک
مردمکِ چشمِ من

جس کنویں کی منڈیر پر بیٹھ کر
دیکھتی ہے میری سمت
میں نے تھا کھودا اسے
پا نہ سکی چشمۂ آبِ رواں
سخت مشقّت کے بعد بھی کنواں

rekhta
Scanned with CamScanner

صرف اندھیرا ہے یہاں

ملتا ہے کیا اس سے اشارہ تجھے
سخت زمیں کا کیا تھا انتخاب
یا مری کاوش میں کمی تھی کوئی
یا مرے اوزار میں
ورنہ اس جہاں میں
چشمۂ ہائے آب مصفا بھی ہیں
جن کا ہے مسکن سدا
دائرۂ ممکنات

راستے کے موڑ پر
یہ ہے مری خواب گاہ
پر درودیوار پر
رنگ نہیں کوئی بھی
میں نے یہ چاہا بہت
رنگ سنہرا کروں
وہ نہ مجھے مل سکا
یاں ملا نہ واں ملا
عمر ختم ہو گئی
وقت ختم ہو گیا
پس تجھے معلوم ہو تاکید سے
اس جہاں میں ضرور بالضرور
ہیں کہ واں
یہ نہیں
رنگ سنہرا بھی ہے
اور جو نہیں ہے تو اس کو خلق کر
کیونکہ اس کی آرزو
کیونکہ اس کی جستجو
سینۂ مادر میں تھی
سینہ بہ سینہ جو تجھے سونپ دی

لوٹتے ہوئے تجھے دکھاؤں گی
ہیں یہاں
ایسی بھی کچھ جھاڑیاں
جن میں کھلے پھول ہیں سدابہار
روندنے والے قدم
کر نہ سکیں پائمال
سخت جاں، بےمثال
اور عام اس قدر
ان پہ عام طور پر
پڑ نہیں پاتی نظر

ناشکیبائی نہیں

مُہر لگی کس لیے تیرے زرِ سرخ پر
مہر بر لب
مہر بر جاں کس لیے

کھول اپنا روزنِ جاں میں ہوئی بےاختیار
روشنی میں ہوں
مجھے صبر نہیں اس لیے
دیکھنے دے ایک بار
نقش تیری پتلیوں میں اتنا بدپیکر نہ تھا
نقش میرا
جس کی سنتی ہوں پکار
تیرے زرِسرخ کی جستجو میں مس ہے یہ
ناشکیبائی نہیں، روشنی کی حس ہے یہ
مہر بر لب
مہر بر جاں
مجھ میں تو پیوند ہو، نور کا تیرے کمال
اب تو اپنا آتش غم کے دھوئیں سے نکال

نیّر مسعود

سلطان مظفّر کا واقعہ نویس

۱

اب جبکہ سلطان مظفر کے مقبرے کو اس کی زندگی ہی میں اتنی شہرت حاصل ہو گئی ہے کہ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں، مجھ کو حکم ہوا ہے کہ اس کی تعمیر کا واقعہ لکھوں۔ اس حکم کے ساتھ میری خانہ نشینی کا زمانہ ختم ہوتا ہے۔

یہ بات کہ سلطان کا مقبرہ تعمیر ہو چکا ہے، مجھے سلطان ہی سے معلوم ہوئی۔ اور جب سلطان نے مجھے یہ بتایا کہ اس کا مقبرہ اس وادی میں نہیں بنایا گیا جہاں اس کے اجداد کے مقبرے ہیں تو میں سمجھ گیا کہ مقبرہ صحرا میں ہو گا، اس لیے کہ میں اس کی صحرائی مہم کا واقعہ نویس تھا اور جب اس نے یہ بتایا کہ مقبرہ ایک انوکھی عمارت ہے تو میں نے سمجھ لیا کہ یہ عمارت بغیر چھت کی ہو گی، یہ بھی اس لیے کہ میں سلطان کی صحرائی مہم کا واقعہ نویس تھا۔ وہ میری آخری واقعہ نویسی تھی۔ اس کے بعد میری خانہ نشینی کا زمانہ شروع ہوا تھا۔

اس زمانے کی بہت سی باتیں میں بھول چکا ہوں لیکن اپنی خانہ نشینی کا پہلا دن مجھے اتنی اچھی طرح یاد ہے کہ اس کا حال میں ایک مستند واقعہ نویس کی طرح لکھ سکتا ہوں۔

اس دن صبح کی سیر میں مجھے مقبروں والی وادی کے کنارے چھوٹے چھوٹے پودے پڑے نظر آئے تھے جنھیں شاید تھوڑی ہی دیر پہلے زمین سے اکھاڑ کر پھینکا گیا تھا۔ یہ چھتری کی شکل کے ان بڑے درختوں کے پودے تھے جن کی قطاروں نے وادی کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مجھے ان درختوں کا نام نہیں معلوم تھا لیکن میں نے کبھی کبھی ان کے نیچے آرام کیا تھا۔ ان کے تنے سفیدی مائل، شاخیں گھنی تھیں اور ان کے سائے میں نیند آتی تھی۔ میں نے زمین پر پڑے

ہوئے پودوں کو غور سے دیکھا۔ ان میں سے دو کی جڑیں سلامت تھیں۔ انھیں احتیاط سے اٹھا کر میں نے ان کی جڑوں پر بڑے درختوں کے نیچے کی مرطوب مٹی چڑھا دی اور اپنے گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انھیں اپنے باغ میں کہاں پر لگاؤں گا۔ میں راستے میں رُکا نہیں، البتہ ایک چھوٹی جھیل کے کنارے سے گذرتے ہوئے میں نے جھک کر تھوڑا پانی چلو میں لیا اور پودوں کی پتیوں پر چھڑک دیا۔ میرا اندازہ ہے کہ ٹھیک اسی وقت سلطان کا گماشتہ میرے گھر کی طرف روانہ ہوا ہو گا۔

میں اپنے باغ میں دونوں پودوں کو بٹھا چکا تھا اور انھیں دھوپ سے بچانے کی ترکیبیں کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک کے گرد میرے گھر کے بچوں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ اپنے کھیلنے کی چھوٹی چھوٹی چیزوں سے باری باری اس پر سایہ کر رہے تھے اور اس نئے کھیل سے اس قدر خوش تھے کہ اپنی اپنی باری کے لیے جھگڑ رہے تھے۔ میں دوسرے پودے کی پتیوں پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا کہ اس پر سلطان کے گماشتے کی پرچھائیں پڑی۔ میں نے پرچھائیں کو پہلے، گماشتے کو بعد میں، دیکھا۔ بچوں نے پودے کو چھوڑ کر گماشتے کے گرد گھیرا ڈال دیا لیکن کچھ دیر تک اس کے لباس کو غور سے دیکھنے کے بعد وہ اس سے ڈر گئے اور بھاگ کر گھر کے اندر جا چھپے۔

میں نے بھی اس کے لباس کو غور سے دیکھا، اس لیے کہ سلطانی گماشتوں کے پاس ان کے لباس کے سوا کوئی زبانی یا تحریری پیغام نہیں ہوتا۔ ان کی آمد کا مقصد ان کے مقرّرہ لباس سے معلوم ہوتا ہے۔ اس گماشتے کی آمد کا مقصد یہ بتانا ہوتا تھا کہ سلطان کو مجھ سے کوئی خدمت لینا ہے اور مجھے گھر پر رہ کر اس کے حکم کا انتظار کرنا ہے۔ اس انتظار میں کبھی کبھی کئی دن گذر جاتے تھے۔ یہ گماشتہ، یا اس لباس والا گماشتہ، میرے یہاں پہلے بھی آتا رہتا تھا، لیکن اس وقت اسے دیکھ کر مجھے تھوڑا تعجب ہوا، اس لیے کہ سلطان کی صحرائی مہم کو سر ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے اور بہ ظاہر ایک مدت تک اس بات کی توقع نہیں تھی کہ اسے پھر کوئی ایسی مہم درپیش ہو جس کے لیے واقعہ نویس کی ضرورت پڑے۔ لیکن سلطان کا توقع کے خلاف کام کرنا کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر دیر تک تعجب کیا جاتا۔ اس لیے میرے نزدیک اس دن کی سب سے خاص بات یہ تھی کہ میرے لگائے ہوئے دو پودوں میں سے ایک سلطانی گماشتے کے پیروں کے نیچے آ کر کچل گیا تھا، لیکن دوسرا پودا محفوظ تھا اور اس کے بڑے ہوجانے کے بعد میں اس کے نیچے آرام کر سکتا تھا۔

۲

میں اس کے نیچے آرام کر رہا تھا کہ مجھے ایک پرچھائیں حرکت کرتی نظر آئی اور سلطان کا ایک گماشتہ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ گماشتوں کو پہچاننا مشکل نہیں ہوتا اگرچہ ان کے لباس مختلف ہوتے ہیں۔ میں نے کئی بار اوپر سے نیچے تک اس کے لباس کی ہر چیز کو، سلائی کے دھاگوں تک کو، غور سے دیکھا اور باربار اپنے ذہن پر زور دیا۔ وہ میرے اس معائنے

Scanned with CamScanner

[illegible]
اس سے بات کرنے پر مجبور ہوا۔

"اب میری نگاہ ٹھیک کام نہیں کرتی۔" میں نے اس سے کہا۔

"ظاہر ہے۔" وہ میرے بالکل قریب آ کر بولا۔ "اس لیے کہ مجھے دیکھنے کے بعد بھی تم جہاں تھے وہیں ہو۔"

اور مجھے یاد آ گیا۔

"طلبی۔" میں نے کہا۔ "فوراً۔"

گماشتہ تیزی سے مڑ گیا۔ درخت کی ایک اُبھری ہوئی جڑ سے اسے ٹھوکر لگی اور شاید چوٹ بھی آ گئی۔ جب وہ واپس ہو رہا تھا تو اس کے پاؤں میں ہلکا سا لنگ تھا۔ شاید اسی لیے میں اس سے پہلے گھر سے باہر نکلا۔ کچھ دور چل کر میں رکا اور جب گماشتہ مجھ سے چند قدم آگے ہو گیا تو میں اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

سلطان سے احکام لے کر واپس آتے ہوئے میں نے اپنی پرانی عادت کے مطابق بازاروں والا راستا اختیار کیا۔ کئی چھوٹے بازاروں میں رک رک کر وہاں کی خریدوفروخت کو دیکھتا ہوا میں بڑے بازار میں داخل ہوا۔ بازار قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا میں نے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا۔ البتہ مجمع وہاں پہلے سے زیادہ نظر آ رہا تھا۔ بازار والوں کی مقررہ جگہوں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی اس لیے میری نظر سب سے پہلے ان باغبانوں پر پڑی جو زمین پر پھول پودے بچھائے بیٹھے تھے۔ لیکن ان میں وہ بوڑھا باغباں دکھائی نہیں دے رہا تھا جس سے میں ہمیشہ، اور کبھی کبھی بلاضرورت بھی، پودے خریدا کرتا تھا۔ دوسرے باغبانوں کے برخلاف وہ اپنے مال کو اس طرح ترتیب کے ساتھ سجا کر بیٹھتا تھا کہ اس کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ لگا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ بازار کے دوسرے باغبانوں کی طرح وہ بھی سلطانی باغوں میں کام کرتا تھا۔ اور ان فاضل پودوں کو بازار میں لے آتا تھا جو باغوں کی آرائشی ترتیب میں خلل پیدا کرنے کی وجہ سے اکھاڑ دیے جاتے تھے۔

بازار کے اس سرسبز حصے میں اس وقت میرے علاوہ صرف ایک گاہک اور تھا۔ باغبانوں نے ہمیں دیکھتے ہی پکار پکار کر مختلف پھولوں اور پودوں کے نام گنانا شروع کر دیے۔ یہ ان کا دستور تھا۔ لیکن وہ بوڑھا باغباں ان موقعوں پر خاموش رہتا تھا۔ اس وقت بھی میں نے دیکھا کہ ان بولتے ہوئے باغبانوں کے ہجوم میں ایک آدمی چپ بیٹھا ہے۔ میں اس کے سامنے جا کر رکا تو وہ خاموشی کے ساتھ اپنے سامنے لگے ہوئے پودوں کو اِدھر سے اُدھر کرنے لگا۔ میں نے زمین پر بیٹھ کر یوں ہی کچھ پودے اٹھا کے دیکھے، پھر پوچھا:

"یہاں ایک بوڑھا بیٹھا کرتا تھا، پودوں کو سجا کر۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میں نے دیکھا کہ دوسرا گاہک بھی میرے قریب آ کر بیٹھ گیا ہے اور ایک بڑے زرد پھول کی پنکھڑیوں کو چھیڑ رہا ہے۔ میں نے نوجوان باغباں کو ایک

نظر دیکھ کر اس میں بوڑھے باغباں سے مشابہت تلاش کی۔

"وہ تمھارا کون تھا؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"دادا۔" اس نے کہا۔

"تم بھی سلطانی باغ میں کام کرتے ہو؟"

اس نے پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اپنے دادا کی جگہ پر؟"

"باپ کی جگہ پر۔" اس نے کہا۔

میں نے پورے بازار پر نظر دوڑائی اور پھر محسوس کیا کہ مجمع زیادہ ہو جانے کے سوا اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ البتہ میرے داہنی جانب جس بڑے چبوترے پر تماشے دکھائے جاتے تھے وہ پہلے سے کچھ زیادہ اونچا معلوم ہو رہا تھا اور اس کے کنارے جگہ جگہ سے کٹ گئے تھے۔ چبوترے پر مجمع بازار کے دوسرے حصوں سے زیادہ تھا، لیکن وہاں پہلے بھی مجمع زیادہ رہتا تھا۔ میں پھر باغباں کی طرف متوجہ ہو گیا:

"بڑے درختوں کے پودے نہیں ہیں؟"

اس نے کچھ پودے الگ کر کے میرے سامنے رکھ دیے۔ میں نے پودوں کو سرسری طور پر الٹ پلٹ کر دیکھا۔ دوسرا گاہک اب بھی زرد پھول کو چھیڑ رہا تھا اور اس کی دو پنکھڑیاں نیچے لٹک آئی تھیں، لیکن وہ پھول کے بجائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"تم اسے خراب کر رہے ہو۔" میں نے اس سے کہا۔

"یہ میں نے لے لیا ہے۔" اس نے باغباں کو بتایا اور پھول کے پودے کو کھینچ کر باہر نکال لیا۔

اس کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے خیال ہوا کہ کسی وجہ سے وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ میں نے ایک بار اس کو غور سے دیکھا۔ لیکن اس کی صورت میری پہچانی ہوئی نہیں تھی۔ میں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر اسے دیکھا لیکن اس میں مجھے اپنے کسی جاننے والے کی مشابہت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ پھر بھی وہ باربار میری طرف دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے الجھن سی ہوئی اور میں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے لگا۔ لیکن اسی وقت میری نظر باغباں کے پہلو میں سبز پودوں کے ایک چھوٹے سے ڈھیر پر پڑی۔ میں بیٹھ گیا، پھر اٹھا اور گھوم کر باغباں کے پہلو میں آیا۔ میں نے ایک ایک پودے کو اٹھا کر دیکھا، پھر باغباں سے کہا:

"ان کی جڑیں نہیں ہیں۔"

"یہ لگانے کے لیے نہیں ہیں۔"

"پھر؟" دوسرے گاہک نے پوچھا۔

"لوگ لے جاتے ہیں۔" باغباں نے کہا۔ "انھیں کھلانے کے لیے۔" اور اس نے تماشوں والے چبوترے کی طرف اشارہ کیا۔

دوسرا گاہک اب میرے پہلو میں کھڑا تھا۔ اس نے جھک کر ان میں سے دو تین پودے

Scanned with CamScanner

"ان میں کیا خاص بات ہے؟"

"زہر۔"

اور میں سمجھ گیا کہ چبوترے پر کوبن لوگ تماشا دکھا رہے ہیں۔ میں نے باغبان سے، یا شاید اپنے آپ سے، پوچھا:

"یہ لوگ پھر آنے لگے ہیں؟"

"کیا یہ لوگ پہلے بھی آتے تھے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

وہ لوگ پہلے بھی آتے تھے۔ صحرا ان کا مسکن تھا اور ہر سال تماشوں کے موسم میں ایک بار شہر کی طرف ان کا پھیرا ہوتا تھا۔ وہ دوپہر سے لیکر سورج ڈھلنے تک اپنا تماشا دکھاتے تھے، اور جب تک وہ چبوترے پر موجود رہتے، دوسرے تماشاگروں کی طرف کوئی رخ نہ کرتا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی دوسروں سے ان کا جھگڑا بھی ہو جاتا جسے تماشائی ختم کراتے تھے۔

اور ان کا تماشا یہ تھا کہ وہ سب کچھ کھا لیتے تھے۔ تماشائی ان کے لیے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسی چیزیں لاتے جنھیں ان کے خیال میں کوئی انسان بلکہ کوئی جانور بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ لیکن یہ صحرا کے رہنے والے ہر چیز کھا لیتے اور اس کے بدلے میں تماشائیوں سے انعام پاتے تھے۔ لوگ ان کا تماشا دیکھ کر کبھی ہنستے ہنستے زمین پر بیٹھ جاتے۔ کبھی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹنے لگتے، اور کبھی کراہت سے منھ پھیر لیتے۔ اس تماشے سے کسی کسی تماشائی کی طبیعت بگڑ جاتی اور اس کے ساتھی اسے الگ ہٹا لے جاتے۔ لیکن چبوترے پر لگا ہوا مجمع دوپہر سے لے کر سورج ڈھلنے تک کسی بھی وقت کم نہ ہوتا تھا۔

سلطان کی صحرائی مہم شروع ہونے سے کئی موسم پہلے ہی ان لوگوں نے شہر میں آنا چھوڑ دیا تھا، اور بڑے بازار کے چبوترے پر مجمع کم رہنے لگ تھا۔ صحرائی مہم ختم ہونے کے بعد بھی یہ لوگ نہیں آئے۔ مجھے یقین تھا کہ اب شہر میں ان کا تماشا کبھی دیکھنے میں نہیں آئے گا۔ لیکن اس وقت وہ تماشا دکھا رہے تھے اور بڑے بازار کے چبوترے پر مجمع ہمیشہ سے زیادہ تھا۔ اس مجمعے میں سے دو تین تماشائی چبوترے پر سے نیچے کودے اور آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے ہماری طرف آئے۔

"لاؤ۔" ان میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر باغبان سے کہا۔

دوسرے گاہک نے اپنے ہاتھ کے پودے زمین پر ڈال دیے اور تماشائیوں نے دوسرے پودوں کے ساتھ انھیں بھی سمیٹ لیا۔

تماشائیوں کے واپس جانے کے بعد میں بھی مڑا۔ مجھے باغبان کی آواز سنائی دی:

"ان کے زہر کا کوئی توڑ نہیں ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "انھیں شہر کے اندر نہیں لگایا جاتا۔"

"میرے گھر میں ایک لگا ہے۔" میں تماشوں والے چبوترے کی طرف بڑھ گیا۔

سورج ڈھلنے میں ابھی دیر تھی۔ چبوترے کے قریب پہنچ کر میں رکا۔ دوسرا گاہک میرے برابر سے ہوتا ہوا چبوترے پر چڑھ گیا۔ میں نے اسے تماشائیوں کی بھیڑ میں گم ہوتے دیکھا لیکن جب میں بازار سے آگے بڑھ کر صحرا کے راستے پر مڑا تو وہ کچھ فاصلے پر میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ میں خاموشی کے ساتھ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ شہر کی حد ختم کے قریب پہنچی اور دور پر صحرا کا حاشیہ نظر آنے لگا۔ میں رکا اور ستانے کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بھی خاموشی کے ساتھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ آخر میں نے اس سے پوچھا:

"کیا مجھے پہچانتے ہو؟"

اس نے میرے قریب کے پتھر پر بیٹھ کر انگڑائی سی لی۔

"پہچانتے ہو؟" میں نے پھر پوچھا۔

"سلطانی مظفر کا واقعہ نویس۔" اس نے اعلان کرنے کے سے انداز میں کہا۔ "اس مقبرے کے بننے کا حال لکھنے کے لیے مقرر ہوا ہے جسے اس نے بنتے نہیں دیکھا۔"

اس کے بعد وہ یوں چپ ہو گیا جیسے اس نے کچھ کہا ہی نہ ہو۔

سلطانی کا کارندہ، میں نے سوچا، اور اس سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے اذیّت دینے کے لیے مقرر ہوے ہو؟"

لیکن وہ خود کسی اذیّت میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اس کے ساتھ مبہم سی ہم دردی محسوس ہوئی۔

"میں تمھیں مقبرے کو دیکھتے ہوے دیکھنے پر مامور ہوا ہوں۔" اس نے کہا۔

"صرف دیکھنے پر؟"

"ور اس پر کہ جب تم اس کی تعمیر کا واقعہ لکھ لو تو میں اس کی تاریخ لکھوں۔"

مجھے حیرت ہوئی اس لیے کہ اس کی عمر زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔

"سلطانی مورّخ؟" میں نے پوچھا۔ "اور وہ جو تم سے پہلے تھا؟"

"مجھ سے پہلے کئی تھے۔"

"جو صحرائی مہم کے زمانے میں تھا۔"

"اسے مرنا پڑا۔"

اسی وقت صحرا کی طرف سے آتے ہوے لوگوں کا ایک جتّھا ہمارے قریب سے گذرا۔ یہ دوسرے شہروں کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ پھر کچھ اور جتھے گذرے۔ صحرا کی طرف جاتا ہوا مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ کچھ دیر تک ہمارے آس پاس سنّاٹا رہا، پھر راستوں پر عارضی دکانیں لگانے والے اپنے اپنے مال کے ساتھ تیز قدموں سے ہماری طرف آتے دکھائی دیے۔ ہمارے قریب پہنچ کر ان میں سے ایک دو زرا سا رکے، لیکن ہمارا دھیان کسی بھی طرف نہ دیکھ کر آگے بڑھ گئے۔ پھر مجھے اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے محسوس ہونے لگا کہ اب صحرا میں سنّاٹا ہے۔

Scanned with CamScanner

"وقت ہو گیا۔" اس نے کہا، اور صحرا کی طرف چل دیا۔

میں نے سورج کو ڈھلتے ہوئے دیکھا اور اٹھ کر اس کے برابر برابر چلنے لگا۔ ہم خاموشی کے ساتھ راستا طے کرتے ہوئے صحرا کے حاشیے تک آ گئے۔ مجھے دور پر ایک عمارت کا ہیولا نظر آیا۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک لمبی سیدھی سڑک بنا دی گئی تھی۔ سڑک پر پتھر کی چھوٹی چھوٹی سلوں کا فرش تھا جس کے دونوں کناروں پر نیچی نیچی سی خانوں‌دار دیواریں اٹھائی گئی تھیں۔ سڑک دونوں کناروں پر اتنی ڈھلواں تھی کہ اس پر جمع ہونے والی ریت دیواروں کے نچلے خانوں سے مسلسل باہر گر رہی تھی، جیسے شہر کی برسات میں نالیوں سے پانی نکلتا ہے۔ ہم اس سڑک کو بھی خاموشی کے ساتھ طے کرتے رہے۔ مقبرہ اب نظر نہیں آ رہا تھا اور سڑک رفتہ رفتہ بلند ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ اس کا خاتمہ ایک اونچے چبوترے کی سیڑھیوں پر ہوا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر چبوترے پر پہنچے۔ چبوترے کے دوسری جانب ویسی ہی ایک سڑک نشیب کی طرف جا رہی تھی۔ اس سیدھی سڑک پر بہت آگے، جہاں اس کی دونوں دیواریں قریب قریب ملی ہوئی نظر آ رہی تھیں، مقبرہ اس کے راستے میں حائل تھا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سڑک ایک نوک کی طرح اسے چیرتی ہوئی صحرا کے قلب تک پہنچ گئی ہے۔

میں پھر تھک گیا تھا۔ صحرا کی ہوا کے گرم تھپیڑے میری تھکن کو بڑھا رہے تھے لیکن ان میں قریب آتی ہوئی شام کی خنکی بھی شامل ہونے لگی تھی اس لیے میں نے کچھ دیر چبوترے پر سستانے کا فیصلہ کیا۔ چبوترے کا سفید سنگی فرش گرم تھا پھر بھی میں اس پر بیٹھ سکتا تھا۔ میں بیٹھ گیا۔ اتنے فاصلے سے مقبرے کی عمارت میں مجھے کوئی انوکھا پن محسوس نہیں ہوا۔ اس کی کٹاودار مدوّر چھت پر ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے کہا:

"اس کی چھت..."

"نہیں ہے۔" میرا ساتھی بولا۔ "صرف دور سے نظر آتی ہے۔"

"قریب چل کر دیکھیں۔"

"نہیں۔" اس نے کہا۔ "جب تک نگراں نہ آ جائے۔"

نگراں کے انتظار میں مجھ کو سنگی فرش پر کچھ دیر اور بیٹھنا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسی سڑک سے آئے گا جس سے ہم آئے تھے۔ لیکن وہ مقبرے کے پیچھے سے گھوم کر آتا دکھائی دیا۔ تیز قدموں سے چلتا ہوا وہ چبوترے پر چڑھا، رسمی انداز میں ہمارے سامنے جھکا اور آہستہ سے پیچھے مڑ کر ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔ چبوترے سے مقبرے کا فاصلہ میرے اندازے سے کم تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم اس کے پھاٹک کے سامنے کھڑے تھے۔ یہاں پہنچ کر نگراں نے بولنا شروع کیا۔ زمین کی پیمائش سے لےکر پتھر کی آخری سل کے رکھے جانے تک کا حال اس نے اس طرح بیان کیا جیسے مجھے مقبرہ بنتے دکھا رہا ہو۔ کہیں کہیں تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں اس کا کہا ہوا سن نہیں رہا ہوں بلکہ اپنا لکھا ہوا پڑھ رہا ہوں۔

بیان ختم کرنے کے بعد نگراں چبوترے کی سمت بڑھا تھا کہ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ

"تم نے سب کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے کہا، "لیکن میں اسے دیکھنا بھی چاہتا ہوں۔"

پھر میں پھاٹک کے اندر داخل ہو گیا۔ مجھے ہر طرف دیواریں ہی دیواریں نظر آئیں۔ اونچی نیچی دیواریں مختلف زاویوں سے ایک دوسرے کے قریب آتیں، پھر دور ہو جاتیں۔ سب سے اونچی دیواریں سب سے پیچھے تھیں۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں اٹھائی گئی تھیں اور یہی دور سے چھت کا فریب دیتی تھیں۔ دیواروں کی کثرت سے، اور کچھ اس وجہ سے کہ سورج نیچا ہو چکا تھا، مقبرے کے اندر اندھیرا اندھیرا سا تھا اور اس پر چھت کا نہ ہونا محسوس نہیں ہوتا تھا۔ دیواروں نے ادھر اُدھر گھومتی ہوئی راہ داریوں کی بھول بھلیاں سی بنا دی تھی جس کے وسط کا پتا لگانا ممکن نہ تھا۔ اور جب میں نے باہر نکلنا چاہا تو مجھے راستا نہیں ملا۔ شاید اسی لیے لوگ دور دور سے مقبرے کو دیکھنے آتے تھے۔ میں دیر تک ان راہ داریوں میں بھٹکتا پھرا، یہاں تک کہ نگراں مجھے ڈھونڈھتا ہوا آ پہنچا۔

کچھ دیر بعد ہم پھر اسی چبوترے پر تھے۔ میں نے نگراں سے کہا:

"مجھے کچھ اور بھی معلوم کرنا ہے۔"

وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

"میں نے شروع سے آخر تک سب بتا دیا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"تم نے اسے شروع سے آخر تک بنتے دیکھا ہے؟"

وہ خاموش رہا۔

"اسے بنانے میں صرف شہر کے لوگوں سے کام لیا گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بعد میں صحرا والوں سے بھی۔"

"ان کا نگراں کون تھا؟"

"میں تھا۔"

"کیا تمھیں معلوم تھا کہ وہ مقبرہ بنا رہے ہیں؟"

"معلوم تھا۔ تمھیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔"

"کہ وہ سلطان کا مقبرہ بنا رہے ہیں؟"

وہ پھر چپ رہا اور پہلے سے زیادہ پریشان نظر آنے لگا۔

"مقبرے کے لیے جگہ کس نے مقرر کی تھی؟"

"سلطان نے۔"

"پتھر کہاں سے آیا؟"

"بتا چکا ہوں۔ مقبروں والی وادی کے پار جو پہاڑوں کا سلسلہ ہے..."

"وہاں سے لایا گیا تھا، مگر کس عمارت کے لیے؟"

"وہ مقبرے میں لگایا گیا ہے۔"

"مقبرہ ٹھیک اس جگہ پر ہے جہاں صحرائی مہم والا قلعہ تھا۔ قلعے میں کون سا پتھر

Scanned with CamScanner

"اس نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولا،

"مجھے مقبرے کا حال بتانے کا حکم ہوا ہے، قلعہ میں نے نہیں دیکھا۔"

"اسے گرا دیا گیا تھا۔" میں نے اس کو بتایا۔

"نگران خاموش کھڑا رہا۔ میں نے مقبرے کی طرف جاتی ہوئی سڑک کو دیکھا، پھر صحرا میں آتی ہوئی سڑک کو۔ دونوں سڑکیں ایک سی تھیں، بلکہ اگر چبوترہ نہ ہوتا تو وہ ایک ہی سڑک تھی۔

"یہ چبوترہ۔۔۔" میں نے چبوترے کے خوبصورت ترشے ہوئے سفید پتھروں پر جھک کر پوچھا، "یہ چبوترہ کیوں بنایا گیا ہے؟"

"آرام کرنے کے لیے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کے اوپر؟"

"ظاہر ہے۔" اس نے کہا۔

"اس کے نیچے کیا ہے؟"

"ریت۔"

"اس کی جگہ بھی سلطانی سی نے مقرر کی تھی؟"

"نہیں، سلطانی کارندوں میں سے کسی نے۔" وہ بولا۔ "مگر سلطان ہی کے حکم سے۔"

"ظاہر ہے۔" میں نے بھی کہا۔

وہ بار بار سورج کی طرف دیکھ رہا تھا، اس لیے میں نے اس سے آخری سوال کیا،

"یہ بتانا کیوں ضروری نہیں تھا کہ مقبرے میں قلعے کا پتھر استعمال ہوا ہے؟"

"میں نے وہ سب بتا دیا ہے جو بتانے کا مجھے حکم تھا۔" اس نے کہا اور مجھے اس کے لہجے میں جھلاہٹ کے ساتھ ہلکے سے خوف کی آمیزش محسوس ہوئی۔ "اس کے سوا تم جو کچھ لکھو گے وہ میرا بتایا ہوا نہیں ہو گا۔" پھر وہ میرے ساتھی کی طرف مڑا اور بولا، "اور اس کی کوئی تمہیں دینا ہو گی۔"

وہ چبوترے سے شہر کی طرف والی سڑک پر اترا اور اس کے بائیں پہلو کی دیوار پر ہاتھ ٹیکتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ سڑک کے ڈھلوان کنارے پر جمع ہونے والی ریت اس کے پیروں سے منتشر ہو کر دیوار کے نچلے خانوں سے اور بھی تیزی کے ساتھ باہر گرنے لگی اور ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں اس کے بہت سے ذرّے مجھے چنگاریوں کی طرح چمکتے نظر آئے۔

نگران کے آخری جملے نے مجھے اپنے ساتھی کا وجود یاد دلا دیا تھا۔ میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی عمر واقعی کم تھی۔ میں نے اس سے پوچھا،

"تمہیں تاریخ لکھنا کس نے سکھایا؟"

"کسی نے نہیں۔" وہ بولا۔ "میں نے صرف پڑھا ہے۔"

"کتنا پڑھا ہے؟"

اس نے کئی علموں کے نام گنا دیے۔

"اور تاریخ؟"

"صرف ایک، صحرائی مہم کی تاریخ۔"

مجھ کو صحرائی مہم کے زمانے والا مورّخ یاد آیا۔ وہ میرا واحد دشمنی تھا۔ مجھے اس کی آواز یاد آئی، اور یہ بھی کہ جب وہ ہنستا تھا تو اس کی آنکھیں اپنےآپ بند ہو جاتی تھیں۔

"تم نے کہا تھا اسے مرنا پڑا۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ صحرائی مہم کی تاریخ سلطان کو پسند نہیں آئی تھی۔"

"لیکن وہ بہت اچھا مورخ تھا۔"

"اس نے تاریخ میں وہ سب لکھ دیا تھا جو صحرائی مہم کے واقعہ نویس نے لکھا تھا۔" وہ بولا، کچھ رکا، پھر بولا۔ "یہ بات اس نے اپنی صفائی میں بھی کہی تھی۔"

"صفائی میں؟" میں نے پوچھا، "اور اس پر الزام کیا تھا؟"

"یہی۔ اس نے تاریخ میں وہ سب لکھ دیا تھا جو واقعہ نویس نے لکھا تھا۔"

"اسے کس طرح مرنا پڑا؟"

"کسی درخت کے زہریلے پھل کھا کر۔"

"سلطان کے حکم سے؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر پوچھا،

"سلطان کے حکم سے؟"

"سلطان کے حکم سے وہ تاریخ اب میں لکھ رہا ہوں۔"

"وہ اب تمہارے پاس ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اور واقعہ نویس کا بیان بھی؟"

"واقعہ نویس کا بیان بھی۔"

"اسے ضائع نہیں کیا گیا؟"

"کیا جائے گا، جب میں تاریخ لکھ کر سلطان کو پیش کر دوں گا۔ مجھے یقین دلایا ہے۔"

"کہاں تک لکھ چکے ہو؟"

"صحرا میں سلطان کا پہنچنا۔۔۔"

"۔۔۔اور قلعے میں۔۔۔"

"۔۔۔ وہاں کوئی قلعہ نہیں تھا۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، اور اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا،

"کوئی قلعہ نہیں تھا، اور قلعے میں کوئی عورت نہیں تھی۔"

میں نے اور زیادہ حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

"تم نے لکھا ہے۔" وہ تیز آواز میں بولا۔ "میں نہیں لکھوں گا۔ مجھے اس کا حق دیا گیا ہے۔"

"اس لیے یہ تمھارا فرض بھی ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"مگر ہم اس کی، مہم کی، بات کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے کہا۔ پھر مجھے چبوترے کے سنگی فرش پر بیٹھتے دیکھ کر میری طرف بڑھا اور بولا، "کچھ دیر میں یہاں اندھیرا ہو جائے گا۔"

"میں ابھی یہیں رہوں گا۔" میں نے کہا۔ "شاید یہاں مجھے صبح ہو جائے۔"

"آج ہی سے لکھنا شروع کر دو گے؟"

"نہیں۔ کاغذ مجھے کل ملیں گے۔" میں نے کہا، پھر اسے بتایا، "واقعہ نویسی سلطانی کاغذوں پر ہوتی ہے۔ کاغذ تمھیں بھی ملیں گے لیکن ان پر سلطان کی مہر نہیں ہو گی اور وہ گن کر نہیں دیے جائیں گے۔"

اسے یہ بتاتے وقت مجھے خیال نہیں رہا کہ اس کے پاس ایک واقعہ نویس کا بیان موجود ہے، اور خود وہ تاریخ لکھنا شروع کر چکا ہے۔ اس نے میری بات کو بےتوجہی سے سنا، البتہ ابھی تک وہ مجھ سے خفا خفا سا تھا لیکن اب اس نے میرے برابر زمین پر بیٹھ کر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور رازدارانہ لہجے میں بولا،

"اس مقبرے کا بننا... کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم دونوں اس کے بننے کا حال ساتھ ساتھ لکھیں؟"

"پھر تمھیں بھی اپنی صفائی میں کہنا پڑے گا کہ تم نے وہ سب لکھ دیا ہے جو مقبرے کی تعمیر کے واقعہ نویس نے لکھا تھا۔"

وہ کچھ دیر گم سم بیٹھا رہا، پھر میرے کندھے پر زور دے کر اٹھ کھڑا ہوا اور بولا،

"مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"تمھارا کام میرے بعد شروع ہو گا۔" میں نے کہا، "ابھی آرام کرو۔"

"اور تم یہیں رہو گے؟" اس نے قدرے تشویش کے ساتھ کہا۔ "یہاں رات کو ٹھنڈک زیادہ ہو جاتی ہے۔"

"میں برداشت کر لوں گا۔" میں نے کہا۔ "نہیں تو مقبرے کی دیوار پناہ دے گی۔"

اس وقت نہ مجھے خیال آیا اور نہ شاید اسے، کہ مقبرے میں صرف دیواریں ہیں۔

اس کے جاتے ہی صحرا میں اندھیرا پھیلنا شروع ہوا اور میرے سامنے مقبرے کی عمارت دھندلا گئی۔ میں کئی بار پہلو بدل کر ذرا آرام سے بیٹھ گیا۔ اب صرف اتنا معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی عمارت ہے، اور اس عمارت کی وجہ سے مجھ کو یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ میں صحرا میں ہوں۔ کچھ دیر بعد یہ عمارت ایک بہت بڑے دھبّے کی طرح رہ گئی اور دیکھنے والے کا تصوّر اسے کوئی بھی شکل دے سکتا تھا۔ میرے تصور نے اسے قلعے کی شکل دی اور دیکھتے دیکھتے مجھے اس کا بُرج اور فصیل نظر آنے لگی۔ شہر کی جھیلوں پر سے واپس آتے ہوئے صحرائی پرندوں کے پروں کی سنسناہٹ میرے قریب ہوتی ہوئی دور نکل گئی، اور مجھے

سلطان کی صحرائی مہم یاد آئی۔ میں نے اسے بھلانا چاہا، لیکن یہ بےسود تھا۔

۴

مجھے قلعے کے مشرقی بُرج میں بٹھایا گیا تھا۔ گنے ہوئے سُلطانی کاغذوں کا پلندہ میرے سامنے تھا۔ سفید پتھر کا ایک خوبصورت مُہرہ اسے دبائے ہوئے تھا تاکہ ہوا، جو بُرجوں پر ہمیشہ تیز رہتی ہے، کاغذوں کو اڑا نہ لے جائے۔ ہر کاغذ کی پیشانی پر سلطان کی سنہری مُہر .. ایک تاج، دو تلواریں اور اُن پر سایہ کیے ہوئے ایک چھتری .. نکلتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہی تھی۔ مجھے بُرج میں اُس وقت بٹھا دیا گیا تھا جب سورج نکلنے میں دیر تھی، اس لیے میں اُن لوگوں کو نہیں دیکھ سکا جو مجھے بُرج تک لا کر خاموشی سے نیچے اُتر گئے تھے۔ میں سفید مہرے پر ایک ہاتھ رکھے سورج نکلنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اس کی روشنی کو ہر طرف پھیلی ہوئی ریت کی لہروں پر دوڑتے دیکھوں، اور اس کے بعد میری آنکھیں جو کچھ دیکھیں، میرا قلم اس کو کاغذ پر لے آئے۔ یہ میرے لیے آسان تھا، اس لیے کہ میں جو کچھ دیکھتا اور لکھتا تھا اس کو سمجھنے سمجھانے کی ذمےداری مجھ پر نہیں ہوتی تھی۔ اور صحرائی مہم کے بارے میں تو مجھے کچھ بتایا بھی نہیں گیا تھا۔ میں شہر کے بازاروں میں صرف یہ سنتا تھا کہ مہم شروع ہو چکی ہے اور سلطان خود بھی صحرا میں ہے۔ پھر آدھی رات کے وقت میری فوراً طلبی ہوئی اور اندھیرے ہی میں مجھے سلطانی کاغذ کے پلندے کے ساتھ مشرقی بُرج میں بٹھا دیا گیا۔ اُس وقت مجھے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ میں کسی قلعے کے برج میں ہوں یا میرے بیٹھنے کے لیے بلندی پر کوئی عارضی چوکی بنائی گئی ہے تاکہ صحرا میں دور دور تک جو کچھ ہو وہ مجھے صاف دکھائی دے۔ اس لیے میرا دماغ بالکل خالی تھا اور میں روشنی کا انتظار کر رہا تھا۔

لیکن جب روشنی پھیلی تو مجھے اپنے سامنے قلعے کی فصیل نظر آئی جس کے پیچھے خاموش آسمان کے سوا کچھ نہ تھا۔ میرے برج اور فصیل کے درمیان ایک چھت تھی اور اس چھت پر میں نے سلطانی کو کپڑوں کے ایک ڈھیر پر جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ اسی طرح جھکا رہا یہاں تک کہ سورج کی پہلی کرنیں آ پہنچیں۔ تب وہ اٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا فصیل تک گیا۔ فصیل اس کے قد سے کچھ کم تھی۔ اُس نے پنجوں پر کھڑے ہو کر فصیل کے باہر جھانکا، پھر وہ چھت کی طرف مڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کمر سے اوپر وہ پورا جنگی لباس پہنے ہوئے تھا جس کے فولادی حصّوں پر سورج کی کرنیں پڑنے سے ستارے سے چمکتے تھے۔

"ہر طرف صحرا ہی صحرا ہے"، اُس نے کہا۔ اُس کی بھاری آواز یہاں کُھلی فضا میں کچھ کھوکھلی سی معلوم ہوئی۔

"صحرا ہی صحرا"، اس نے پھر کہا، اور مجھے گمان ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے، لیکن اُسی وقت مجھے چھت پر کپڑوں کے ڈھیر میں حرکت نظر آئی اور میں نے وہاں پر ایک عورت کو کھڑے ہوتے دیکھا۔ اس کا چہرہ اس کے بالوں سے چھپا ہوا تھا اس لیے میں اس کی صورت

Scanned with CamScanner

شہر کی عورت نہیں ہے۔ تہہ در تہہ لباس نے اس کے بدن کے زیادہ حصوں کو ڈھانپ رکھا تھا، پھر بھی مجھے اس کی گردن اور ہاتھوں کے کچھ زیوروں کی چمک نظر آئی۔

"میں دیکھوں"، اس نے سلطان کے قریب پہنچ کر کہا اور دونوں ہاتھ فصیل پر رکھ کر اس طرح زور لگایا جیسے وہ فصیل کے اُوپر جانا نہیں بلکہ فصیل کو اپنی طرف کھینچنا چاہتی ہو۔

سلطان کچھ دیر تک اس کی کوشش کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے عورت کے دونوں شانے پکڑ کر اُسے اوپر اٹھایا اور عورت کے چیخنے کی آواز ایک طرف میرے برج سے ٹکرائی اور دوسری طرف دور کہیں صحرا سے آتی سنائی دی۔ سلطان نےاسے زمین پر ٹکا دیا۔ عورت کے بال اس کے جنگی لباس کے نکیلے حصوں میں اُلجھ گئے تھے اور وہ تکلیف میں تھی۔ سلطان نے مشکل سے اور آہستہ آہستہ اس کے بال چھڑائے اور اس کے دونوں شانے پھر پکڑ لیے۔

"دیکھو"، اس نے عورت کو اوپر اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، لیکن وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی۔

"مجھے نہیں دیکھنا"، وہ نفرت سے بولی، اور چھت پر کپڑوں کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

کچھ دیر بعد سلطان بھی آکر اس کے قریب بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔

اس اجنبی منظر کو دیکھ کر مجھے یہ بھی یاد نہیں رہا کہ میں برج میں واقعہ نویسی کے لیے بیٹھا ہوں، اس لیے میں چپ چاپ سامنے دیکھتا رہا یہاں تک کہ دھوپ تیز ہوئی اور سلطان کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہوگیا۔

"دھوپ پھر بڑھ رہی ہے"، اس نے عورت سے کہا، برج کے پہلو کی طرف اشارہ کیا اور اب شاہانہ لہجے میں بولا، "اُدھر چلو، چھت کے نیچے۔"

"چھت کے نیچے نہیں"، عورت نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا، "وہاں میں مر جاؤں گی۔" اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سلطان یہ جواب کئی مرتبہ سُن چکا ہے، اس لیے کہ وہ کچھ کہے بغیر اٹھا، فصیل تک گیا اور باہر جھانک کر پھر عورت کے پاس آ گیا۔

"مجھے واپس جانا ہو گا"، اس نے کہا، "اور تمھیں میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

"شہر میں نہیں"، عورت نے پھر اُسی لہجے میں جواب دیا، "وہاں چھتیں ہوں گی۔" دھوپ اور بڑھی، اور برج پر کی تیز ہوا میں گرمی آ گئی۔ سلطان نے پھر جا کر فصیل سے باہر جھانکا اور برج کے دوسرے پہلو کی طرف آ کر کسی کو آواز دی۔

"اب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "باہر کچھ ٹھیک دکھائی نہیں دیتا۔"

جواب میں کسی سلطانی کارندے کی آواز سنائی دی جس میں ہلکی سی گونج تھی۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اُس نے کیا کہا، البتہ اس آواز نے مجھے یاد دلا دیا کہ میں سلطان کی صحرائی مہم کاواقعہ نویس ہوں۔

"انھیں گھیرا بنا لینے دو"، سلطان نے کہا۔

کارندے نے کچھ اور کہا۔ سلطان بولا،

کارندے کے کسی اور سوال کے جواب میں اس نے کہا،

"یادگار بھی"، اُس نے عورت کی طرف مڑ کر دیکھا، "اور ثبوت بھی۔"

اس کے بعد اس کی توجہ عورت کی طرف سے قریب قریب ہٹ گئی اور وہ زیادہ تر اُسی کارندے سے سوال جواب کرتا رہا۔ کارندے کی بات مجھے کبھی سنائی دیتی، کبھی نہ سنائی دیتی، کبھی سمجھ میں آتی، کبھی نہ آتی، پھر بھی اس طرح مجھے صحرائی مہم کی کچھ ایسی تفصیلیں معلوم ہو گئیں جن کی واقعہ نویسی میں آنکھوں دیکھے منظروں کی طرح کر سکتا تھا اور میں نے اپنے ذہن میں ان منظروں کو ترتیب دینا بھی شروع کر دیا تھا کہ مجھے پروں کی سنسناہٹ سنائی دی اور چھت پر سائے سے گذرتے دکھائی دیے۔ ان سایوں کے ساتھ لمبی لمبی لکیریں جڑی ہوئی تھیں۔ سائے فصیل سے آگے نکل گئے تو میں نے دیکھا کہ یہ صحرائی پرندوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں تھیں، اور ان ٹکڑیوں کا ہر پرندہ تیر سے چھدا ہوا تھا۔ سلطان نے ان کی اڑان کو حیرت سے دیکھا۔ مجھے بھی حیرت ہوئی، اس لیے کہ یہ پرندے اپنے لمبے پروں کو پورا پھیلائے ہوئے اطمینان کے ساتھ ہوا میں تیر رہے تھے۔ سلطان نے بہ ظاہر اپنے آپ سے کہا،

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیروں کی قوت سے اُڑ رہے ہیں۔"

لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ فصیل سے آگے نکل جانے کے بعد یہ پرندے پر پھڑپھڑاتے اور ہوا میں لوٹیں لگاتے ہوئے نیچے گر جاتے تھے۔ کوئی کوئی پرندہ اتنی تیزی سے لوٹتا کہ اس کے بدن میں چُبھے ہوئے تیر سے آسمان میں دائرہ سا بن جاتا۔ یہ منظر میں نے سلطان کی شکارگاہوں میں باربار دیکھا تھا اور اس کی واقعہ نویسی بھی کی تھی۔

کئی اور ٹکڑیاں چھت کے اوپر سے گذریں۔ سلطان فصیل سے پیٹھ لگائے انھیں غور سے دیکھ رہا تھا، جیسے پرندوں کا شمار کر رہا ہو۔ اچانک اس نے اپنی کمر سے خنجر کھینچ لیا اور کئی قدم آگے بڑھ آیا۔

"ان میں ایک بہت نیچے آ رہا ہے"، اس نے وہیں سے اپنے کارندے کو بتایا، "اور اس کے تیر نہیں لگا ہے۔"

اُسی وقت میں نے دیکھا کہ عورت لپکتی ہوئی سلطان کے قریب آئی، سلطان نے اسے کھینچ کر اپنے پیچھے کر لیا اور خود بھی پیچھے کی طرف خم ہو کر خنجر تانا۔ پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی، ایک پرندہ سلطان اور عورت پر جھکا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ فصیل سے ٹکرا کر وہیں گر جائے گا، لیکن اس نے پروں کو زور سے پھڑپھڑایا اور اوپر اٹھا، فصیل سے آگے نکل کر اُس نے اپنے لمبے پَر پورے پھیلا دیے اور ہوا میں تیرتا ہوا غائب ہو گیا۔ یہ سب ایک ساتھ ہوا اور اسی کے ساتھ میں نے عورت کی چیخ سُنی۔ سلطان کا خنجر اس کے بالوں میں پھنس گیا تھا اور وہ پھر تکلیف میں تھی۔ سلطان نے جھٹکے دے دے کر اپنے خنجر کو آزاد کیا۔ اس میں بالوں کے کئی لچھے کٹ کر فرش پر گرے اور شاید پتھر کی حدّت سے کچھ دیر تک وہیں پڑے پڑے بل کھاتے رہے۔

Scanned with CamScanner

ریت کا بادل سا اٹھا اور آہستہ آہستہ سرکتا ہوا فصیل کے قریب آنے لگا۔ اور اس بار کارندے کی آواز میں نے بالکل صاف سنی۔

"کچھ ہونے والا ہے"، وہ کہہ رہا تھا، "اب کھلی جگہ پر ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

"میں ابھی یہیں رہوں گا"۔ سلطان نے جواب دیا۔ "انہیں گھیرا بنا لینے دو۔"

"کم سے کم وہ اندر بھیج دی جائے۔"

"وہ بھی یہیں رہے گی۔"

"شاید وہ اسے مار دینا چاہیں۔"

"نہیں چاہیں گے"۔ سلطان نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

جواب میں کارندے نے کچھ کہنا شروع کیا تھا کہ اس کی آواز ہوا کے شور میں دب گئی۔ گرم تھپیڑوں نے میرا اپنی جگہ پر بیٹھے رہنا دشوار کر دیا۔ لیکن میں نے سلطانی کاغذوں کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر خود کو پتھر کے مہرے کی طرح فرش پر جما لیا۔ مجھے اس کی اچھی مشق تھی۔ لیکن اڑتی ہوئی ریت سے یہ میرا پہلا سابقہ تھا۔ گڑگڑاتے ہوئے ذرّے مجھے اپنے بالوں میں اور گردن سے ہو کر پیٹھ تک اترتے معلوم ہوئے۔ دھوپ جگ جگ سے دھندلا گئی تھی اور ریت کا بادل، جو دور پر اٹھا تھا، فصیل سے قریب قریب مل گیا تھا۔ ہوا کا اثر اس پر بھی تھا۔ وہ کبھی دبتا، کبھی ابھرتا، کبھی ادھر جھکتا، کبھی اُدھر، اور کبھی اپنی جگہ پر ایک بہت بڑے بگولے کی طرح گھومنے لگتا۔ پھر اس کے پیچھے کئی تیر اٹھے اور سلطان کے پیروں کے پاس گر گئے۔ سلطان نے اسی سکون کے ساتھ جو خطرناک معرکوں میں ہمیشہ اس کے چہرے پر نظر آتے لگتا تھا، جھک کر ایک تیر اٹھایا اور کچھ دیر تک اس کے پھل کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس نے باقی تیروں کو اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے ایک نظر دیکھا اور ہاتھ والا تیر کارندے کی آواز کی طرف پھینک کر بولا،

"اس پر خون کیسا ہے؟"

کچھ دیر بعد کارندے کی آواز آئی۔

"یہ ہمارا تیر ہے، اور خون۔۔۔"

لیکن اچانک اس کی آواز میں کئی اور انسانی آوازیں شامل ہو گئیں، اور اسی وقت مجھے فصیل پر صحرائی پرندوں کا جھرمٹ سا نظر آیا۔ کارندے کی آواز کی طرف سے تیروں کی سنسناہٹ سنائی دی اور پروں کے کئی گچھے تھوڑے بلند ہو کر پیچھے کی طرف الٹ گئے۔ لیکن اتنی ہی دیر میں مجھے اُن کے نیچے آدمیوں کے چہرے نظر آ گئے تھے۔ پھر سلطان کی آواز بلند ہوئی،

"ان کی کلغیاں کن پروں کی ہیں؟"

اسے کوئی جواب نہیں ملا، اور اس کی آواز پھر بلند ہوئی،

"یہ کن کے پر ہیں؟"

پروں کی کلغیاں بہت جلدی جلدی اُبھرنے اور غائب ہونے لگیں۔

"اب کیا حال ہے؟" سلطان نے پکار کر پوچھا، لیکن وہ شاید ایسے موقعوں پر جواب نہ پانے کا عادی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بڑھتا ہوا زمین پر پڑی ہوئی عورت کے سرہانے پہنچا، دیر تک اسے غور سے دیکھتا رہا، پھر جھکا اور عورت کو ایک ہاتھ میں قریب قریب لٹکائے ہوئے اٹھا۔

"سب تیرے لیے"۔ اس نے غراتی ہوئی سرگوشی میں کہا، "سب تیرے لیے۔"

اس کی سرگوشی مجھے ہوا کے شور کے باوجود سنائی دی، اور اس وقت میری نظر پہلی بار عورت کے پورے کھلے ہوئے چہرے پر پڑی۔ شاید بند آنکھوں کی وجہ سے وہ مجھے مری ہوئی سی معلوم ہوئی۔ سلطان اس کو لیے ہوئے اس طرف گھوما جدھر سے کارندے کی آواز آئی تھی۔

"اسے چھت کے نیچے کھینچ لو"، اس نے پوری آواز سے کہا۔

عورت کا بدن ہلکے سے تھرتھرایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کچھ دیر تک وہ بےتعلقی کے انداز میں سلطان کے چہرے کو دیکھتی رہی۔ سلطان کی گھورتی ہوئی آنکھوں میں اچانک پیدا ہو جانے والی سفاکی نے بہ ظاہر اس پر کوئی اثر نہیں کیا۔ اس نے آہستگی لیکن مضبوطی کے ساتھ خود کو سلطان کی گرفت سے چھڑایا اور ہلکے قدموں سے کارندے کی آواز کی سمت چلی، لیکن سلطان نے بڑھ کر اتنی ہی آہستگی اور مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑ لیا اور پھر پوری آواز سے کہا،

"رسّیاں پھینکو۔"

اس کی بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ دو تین رسّیوں کے سرے اس کے قدموں میں آ گرے۔ اس نے عورت کی کمر اور شانوں کو کس کر باندھ دیا۔ مجھے زیوروں کی ہلکی کھنک سنائی دی، پھر میں نے رسّیوں کو تنتے دیکھا لیکن اسی کے ساتھ میری نظر فصیل کی طرف اٹھ گئی۔ ریت کا بادل فصیل کے اوپر رکھا ہوا معلوم ہو رہا تھا اور بادل کے پیچھے ابھرتے اور غائب ہوتے ہوئے پروں کے گچھے صاف نظر نہیں آتے تھے۔ میں نے پھر چھت کو دیکھا۔ سلطان وہاں تنہا کھڑا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ دوسرے شانے پر رکھے وہ کسی خبر کا منتظر معلوم ہوتا تھا۔

اس وقت مجھے لمحہ بھر کو وہم سا ہوا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں، لیکن اسی لمحے ہوا کا ایک تھپیڑا میرے منہ پر پڑا اور گرم ریت میری کھلی ہوئی آنکھوں میں گھس گئی۔ میں نے سر جھکا لیا اور اپنی آنکھوں سے پانی بہنے دیا، یہاں تک کہ اس کے ساتھ ریت کے سارے ذرّے نکل گئے اور میں پھر سے دیکھنے کے قابل ہوا۔ اتنی دیر میں ہوا دھیمی ہو گئی تھی، ریت کا بادل غائب تھا اور فصیل کے پیچھے خاموش آسمان کے سوا کچھ نہ تھا۔ سلطان اسی طرح چپ چاپ کھڑا تھا۔ آخر کارندے کی آواز آئی، جس کے ساتھ کئی آوازیں شامل تھیں جو سلطان کو مہم کے سر ہونے کی مبارک باد دے رہی تھیں۔ سلطان نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر مبارک باد قبول کی، مڑ کر فصیل تک گیا، کچھ دیر تک باہر دیکھتا رہا، پھر مڑا اور بولا،

"صحرا ہی صحرا۔"

Scanned with CamScanner

اور مجھے پھر گمان ہوا کہ وہ مجھ سے مخاطب ہے اور چھت پر سلطان کے سوا کسی اور کو نہ دیکھ کر مجھے اپنا گمان یقین میں بدلتا محسوس ہوا، لیکن وہ میری جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔

"سب حکم کے منتظر ہیں۔" کارندے کی آواز نے کہا۔

"واپسی۔" سلطان نے جواب دیا، پھر ذرا رک کر بولا "اور اسے بتا دو، وہ بھی ساتھ جائے گی۔"

"وہ...." کارندے کی دہشت زدہ آواز آئی "وہ ختم ہو گئی۔"

سلطان نے فصیل سے پیٹھ لگا لی۔

"کس طرح؟" اس نے پوچھا۔

"کچل کر، شاید۔"

"کیا کوئی چھت گر گئی؟" اس نے پوچھا، اور کئی قدم آگے بڑھ آیا۔

"چھتیں اپنی جگہ پر ہیں، لیکن وہ کچل کر مری ہے۔ اس کے چہرے سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ...."

"...واپسی"، سلطان نے بات کاٹ کر کہا، "رات ہونے سے پہلے قلعہ خالی ہو جائے۔"

"اور وہ؟"

سلطان نے آواز کی طرف دیکھا، میرے بُرج کی طرف دیکھا، گردن موڑ کر فصیل کی طرف دیکھا، پھر شفاف آواز میں بولا،

"اسے صحرا میں ڈال دو، کچھ دن میں وہ پھر ریت ہو جائے گی۔"

۵

نکلتے ہوئے سورج کی روشنی مجھے ریت کی لہروں پر دوڑتی دکھائی دی۔ مقبرہ میرے سامنے تھا۔ رات بھر خنکی میں چبوترے پر بیٹھے بیٹھے میرا بدن اکڑ گیا تھا۔ میں نے دھوپ کے کچھ تیز ہونے کا انتظار کیا، اور جب میرا بدن ذرا گرم ہو گیا تو میں نے ایک بار پھر مقبرے کو قریب سے جا کر دیکھا۔ واپسی کے راستے کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں اس کے پھاٹک میں داخل ہوا اور نیم دائرے میں بنی ہوئی آخری دیواروں تک پہنچ گیا۔ ایک دیوار پر مجھے شبہ ہوا کہ اس میں اُس برج کے پتھر استعمال ہوئے ہیں جس کے فرش پر مجھ کو صحرائی مہم کی واقعہ نویسی کے لیے بٹھایا گیا تھا اور میں نے وہاں کچھ نہیں لکھا تھا۔ صحرائی مہم کی رُوداد میں نے اپنے گھر کے باغ میں بیٹھ کر لکھی تھی جہاں اُس وقت تک کوئی بھی سایہ دار درخت نہیں تھا؛ اور اس روداد میں زیادہ تر سُنی ہوئی باتیں تھیں جن کو میں نے آنکھوں دیکھے منظروں کی طرح بیان کیا تھا۔ مگر اس میں وہ بھی تھا جو میں نے بُرج میں بیٹھے بیٹھے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، جس کی وجہ سے ایک سلطانی مورّخ کو، جو میرا واحد دشمن تھا، مرنا پڑا تھا۔

اور اب مجھے اس مقبرے کی تعمیر کا واقعہ لکھنا تھا جسے میں نے بنتے نہیں دیکھا تھا اس کے بننے کا حال مجھے نگراں نے بتایا لیکن اس کو بنا ہوا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے نیا سلطانی مورخ اور اس کی کم عمری یاد آئی اور میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا مقبرے کے پھاٹک سے باہر آ گیا۔

چبوترے پر سے مقبرے کی کٹاوار چھت، جو نہیں تھی، خوب صورت معلوم ہو رہی تھی میں دوسری طرف کی سڑک پر اترا۔ راستے میں مجھے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے جتھے ملے جو دور دور سے مقبرے کی سیر کو آ رہے تھے۔ میرے اوپر صحرائی پرندوں کے جھنڈ تھے جو شہر کی جھیلوں کی طرف جا رہے تھے۔ میں کسی بھی طرف دیکھے بغیر بڑے بازار اور چھوٹے بازاروں سے ہوتا ہوا اپنے گھر میں داخل ہو گیا جہاں سلطان کا کارندہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے سلطان کے مُہری کاغذوں کا پلندہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کاغذوں کو گنا اور کارندہ واپس چلا گیا۔

میں باغ میں آ کر درخت کے سائے میں بیٹھ گیا۔ کاغذوں کو ایک بار پھر گن کر میں نے ارادہ کیا کہ ابھی لکھنا شروع کر دوں۔ کچھ دیر تک سلطان کی سنہری مُہر پر نظریں جمائے رہا۔ تاج اور تلوار کے اوپر سایہ کرنے والی چھتری اس درخت سے مشابہ تھی جو مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ میں لکھنے کے بجائے اس مشابہت پر غور کرنے لگا، یہاں تک کہ مجھے نیند آ گئی۔

یہ سب، شروع سے آخر تک، میں نے سلطان کے مُہری کاغذوں پر لکھا ہے جو گن کر مجھے دیے گئے ہیں اور گن کر مجھ سے واپس لیے جائیں گے۔ واقعہ نویسی کا سلطانی کاغذوں کو اپنے مصرف میں لے آنا ایک نیا جرم ہے جس کی سزا بھی نئی ہونا چاہیے۔ سلطان کو سزائیں ایجاد کرنے کا سلیقہ بھی ہے، اور میں نے ان سزاؤں کی بھی واقعہ نویسی کی ہے۔ لیکن اب مجھ کو حکم ہوا ہے کہ سلطان کے مقبرے کی تعمیر کا واقعہ لکھوں، اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اس حکم کی بھی تعمیل کر دی ہے، اگرچہ خانہ نشینی کے دوران کی بہت سی باتوں کے ساتھ میں واقعہ نویسی کے قاعدے بھی بھول سا گیا ہوں۔ اپنی خانہ نشینی کی مدّت بھی میں نہیں بھول سکتا، لیکن اس ساری مدّت کا حاصل چھتری کی شکل کا یہ درخت ہے جس کے نیچے میں نے بہت آرام کیا ہے۔ اس کی جڑ سے لے کر پھول تک، اور پھل سے لے کر بیج کے گودے تک، ہر چیز میں زہر ہی زہر ہے۔ شاید اسی لیے اس کے سائے میں نیند آتی ہے۔

ooooo

Scanned with CamScanner

Yannis Ritsos

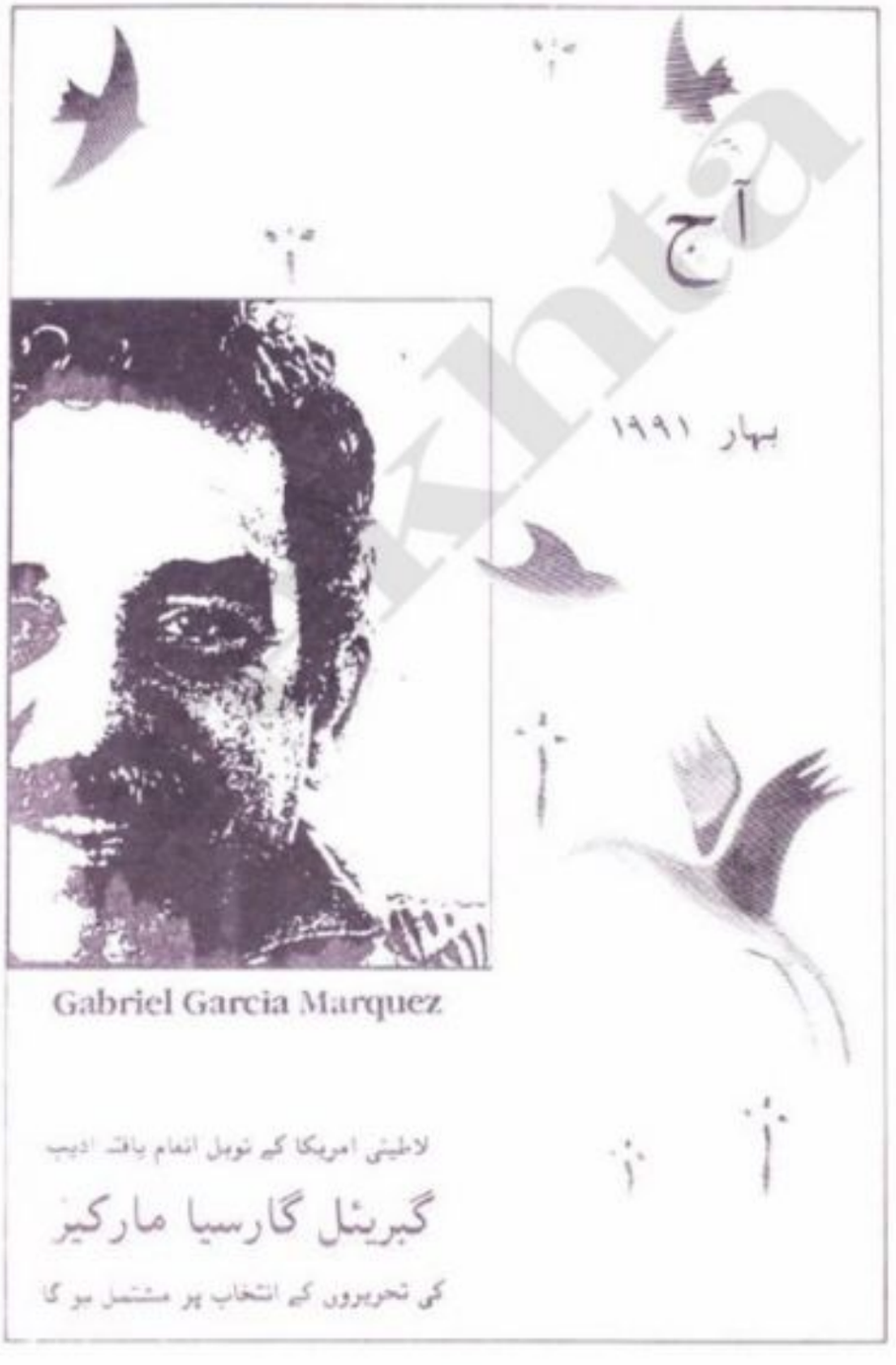

Scanned with CamScanner

یانس رتسوس ۱۹۰۹ میں مونم واسیا (یونان) میں پیدا ہوئے۔ ایشیائے کوچک میں یونان کی شکست کے بعد ان کے گھرانے کو بعض المناک واقعات کا سامنا کرنا پڑا جن کے باعث رتسوس کا لڑکپن نامساعد حالات میں گزرا۔ ۱۹۲۶ میں وہ ملازمت کی تلاش میں ایتھنز چلے آئے اور معمولی دفتری ملازمت کرنے لگے۔ کچھ عرصے بعد تپ دق کا شکار ہونے کی وجہ سے رتسوس کو تین سال سینیٹوریم میں گزارنے پڑے۔ ان مشکل حالات میں انھیں زندگی سے ان کی گہری محبت نے سہارا دیا، جس کا اظہار ان کی شاعری میں بھی اسی طرح ہوتا ہے جس طرح ان کی سیاسی وابستگی میں۔

ان کا پہلا مجموعۂ کلام ۱۹۳۴ میں شائع ہوا اور اب تک پچاس سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں، جن میں زیادہ تر نظموں کے مجموعے ہیں۔ ان کے علاوہ رتسوس نے الیکسانڈر بلوک، اتیلا جوزف، ناظم حکمت، مایا کووسکی، نکولس گیلین، اور رومانیا اور چیکوسلوواکیا کے شاعروں کے یونانی زبان میں ترجمے بھی کیے ہیں۔

اپنی سیاسی وابستگی کے باعث رتسوس کو اپنی طویل اور بھرپور ادبی زندگی میں کئی بار پابندیوں اور صعوبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان کی طویل نظم *Epitaphios* کو، جو سالونیکا میں مزدوروں کے قتلِ عام کے بارے میں لکھی گئی تھی، ۱۹۳۶ میں میتاکسس کی آمریت کے زمانے میں ایتھنز کے زیوس کے معبد کے سامنے ایک باقاعدہ تقریب میں بعض دوسری کتابوں کے ساتھ نذرِ آتش کیا گیا۔ رتسوس کو مختلف یونانی آمریتوں کے ہاتھوں ایک سے زیادہ بار اندرونِ ملک جلاوطنی، کتابوں کی ضبطی اور اشاعت پر پابندی کا کئی کئی سال تک شکار رہنا پڑا ہے۔

رتسوس کی شاعری کا مصوّری سے موازنہ کیا جاتا رہا ہے۔ بلاشبہ رتسوس کی نظمیں اپنے بصری تاثر کے باعث ہمیں آنکھیں کھول کر اردگرد کی دنیا کو دیکھنے پر مجبور کرتی ہیں اور اپنی ظاہری سادگی کے باوجود گہری معنویت رکھتی ہیں۔ رتسوس ہی کے الفاظ میں:

ہر لفظ
ایک ملاقات کا موقع ہے
(جو اکثر ملتوی ہو جاتی ہے)
کوئی لفظ اسی وقت حقیقی ہے
جب وہ اس ملاقات پر اصرار کرے

رتسوس کی نظموں کی اس مختصر سے انتخاب میں رتسوس کے ساٹھ برس کے بھرپور کام کا احاطہ کرنا ناممکن ہے لیکن شاید اس سے اس شاعر کا تھوڑا بہت تعارف ہو سکے جسے لوئی آراگوں "ہمارے زمانے کا عظیم ترین شاعر" کہتا ہے۔

یانِس رِتسوس

پس خوردہ

میرے پاس کچھ نہیں، اور مجھے کچھ یاد نہیں ۔۔ اس نے کہا ۔۔
موسموں کے بدلنے میں پھیکے پڑتے رنگ،
کتنے بوے پھلوں کی باس، دوپہروں میں سفیدی کی چندھیاہٹ۔۔۔
یا، ایک رات جب تم نے دیا سلائی جلائی
تو مجھے تمھارے کان کے نیچے ایک چھپے ایک چھوٹے سے سائے کی جھلک دکھائی دی تھی۔۔۔
بس یہی کچھ۔
باقی ہر چیز کو پیڑوں کے نیچے چلنے والی ہوا
کاغذی رومالوں اور انگور کے پتّوں کے ساتھ اڑا لے گئی

صبح

اس نے دریچے کے پٹ کھولے۔ اس نے پردے سرکائے، اور دن پر نظر ڈالی۔
ایک چڑیا نے سیدھے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ میں تنہا ہوں، اس نے سرگوشی کی۔
میں زندہ ہوں۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔ آئینہ بھی ایک دریچہ ہے۔
اگر میں اس سے چھلانگ لگاؤں تو اپنے ہی بازوؤں میں گر پڑوں گی۔

جادوگر

دور بیٹھے بیٹھے وہ چراغ کی لو دھیمی کر دیتا ہے۔ کرسیوں کو چھوئے بغیر کھسکا دیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

پھر ہاتھ کی ایک طویل حرکت سے وہ کان کے پیچھے سے تاش کے تین پتّے نکالتا ہے۔
درد کو تسکین دینے والا ایک سبز ستارہ
چاندی کے چمچے سے پانی کے گلاس میں گھولتا ہے۔ پانی اور چمچا پی جاتا ہے۔
وہ شفاف ہو جاتا ہے۔ اس کے سینے کے اندر ایک سنہری مچھلی تیرتی دکھائی دینے لگتی ہے۔
تب تھک کر وہ صوفے پر لیٹ جاتا ہے اور آنکھیں بند کر لیتا ہے۔
میرے سر میں ایک پرندہ ہے ۔۔ وہ کہتا ہے۔۔ میں اسے باہر نہیں نکال پاتا۔
دو دیوہیکل پَروں کے سائے کمرے کو بھر دیتے ہیں۔

تیسرا

وہ تینوں کھڑکی کے پاس بیٹھے سمندر کو دیکھ رہے تھے۔
ایک سمندر کی باتیں کر رہا تھا۔ دوسرا سن رہا تھا۔ تیسرا
نہ بول رہا تھا نہ سن رہا تھا۔ وہ بہت گہرے سمندر میں تھا۔ وہ تیر رہا تھا۔
کھڑکی کے شیشوں کے اُدھر شفّاف ہلکے نیلے رنگ میں اس کی حرکات
آہستہ اور واضح تھیں۔ وہ ایک ڈوبے ہوئے جہاز کو تلاش کر رہا تھا۔
اس نے مردہ گھنٹی بجائی۔ چھوٹے چھوٹے بلبلے ہلکی آواز سے پھوٹنے لگے۔ اچانک
"ڈوب گیا؟" ایک نے پوچھا۔ دوسرے نے کہا "ڈوب گیا؟"
تیسرا سمندر کی تہہ میں سے انہیں بیبسی سے دیکھ رہا تھا۔
جیسے کوئی ڈوبے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہے

ہوا

کھڑکی کے سامنے سورج مکھی کے بڑے بڑے پھول
کچّے راستے پر گھوڑے کی ٹاپوں سے اُٹھتا غبار
وہ اب بھی وہاں منتظر کھڑی ہے۔ اُداس
اس کے چہرے پر جھلکتی روشنی شاید سورج مکھی کے پھولوں کی ہے
اچانک وہ بانہیں پھیلا کر ہوا کے پیچھے دوڑتی ہے
وہ گھڑسوار کی تنکوں والی ٹوپی جھپٹ کر سینے سے بھینچ لیتی ہے
اور اندر جا کر کھڑکی بند کر لیتی ہے

مندرا

وہ ساحل پر بالکل برہنہ کھڑا ہے
آسمان اس کے بالوں کو چُومتا ہے، زمیں قدموں کو
ڈوبتے سورج نے اس کے سینے کی چوڑائی پر
ایک سرخ رسّی باندھ دیا ہے
جس کا سِرا اس کے بائیں گھٹنے تک لٹک رہا ہے

اپنے شغل میں تنہا

ساری رات وہ تنہا سفر کرتا رہا، خوف زدہ،
اپنے گھوڑے کی پسلیوں میں بیرحمی سے ایڑ لگاتا ہوا۔
اسے بتایا گیا تھا، وہاں اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ اسے لازماً پہنچنا تھا۔
یہ بہت ضروری تھا۔ صبح کے وقت جب وہاں پہنچا
تو کوئی اس کا انتظار نہیں کر رہا تھا۔ کوئی نہیں تھا۔
اس نے اردگرد دیکھا، سُونے مکان، بند دروازے۔
وہ سو رہے تھے۔
اس نے اپنے پہلو میں اپنے گھوڑے کو ہانپتے ہوئے سنا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔
پسلیاں زخمی تھی اور پیٹھ چھل گئی تھی۔
اس نے اپنے گھوڑے کی گردن میں ہاتھ ڈال دیے اور رونے لگا۔
گھوڑے کی بڑی بڑی سیاہ مرتی ہوئی آنکھیں دو میناروں کی طرح تھیں،
اس کے اپنے مینار، بہت دور
بارش کے ایک لینڈسکیپ میں۔

تقریباً

اس نے دونوں ہاتھوں میں عجیب بےجوڑ چیزیں چُن چُن کر اٹھا رکھی ہیں،
ایک پتّھر، چھت کی ٹائل کا ایک جھڑا ہوا ٹکڑا
سامنے والی دیوار کی ایک رُنگیائی ہوئی کیل
کھڑکی کے راستے اُڑ کر آیا ہوا ایک پتّا
پانی دیے ہوئے گملے سے ٹپکتے قطرے

Scanned with CamScanner

ایک ٹہنی، جو ہوا نے کل تمہارے بالوں میں لا اٹکایا تھا
یہ سب چیزیں جوڑ کر وہ گھر کے پچھواڑے تقریباً ایک درخت بناتا ہے۔
شاعری اس "تقریباً" میں ہے۔
کیا تم اسے دیکھ سکتے ہو؟

سپردگی

اس نے کھڑکی کھولی۔ ہوا کا تیز جھونکا آ کر اس سے ٹکرایا۔
اس کی زلفیں، اس کے کاندھوں کے اوپر دو بڑے بڑے پرندوں کی طرح۔
اس نے کھڑکی بند کر دی۔ دونوں پرندے
میز پر گر کر اس کو تکنے لگے۔ اس نے ان میں منہ چھپا لیا،
اور خاموشی سے رونے لگی۔

ایک بیمار آدمی کا دِن

سارے دن، فرش کے نم گلتے ہوئے تختوں کی بُو
جو دھوپ میں سوکھ کر بھاپ دے رہے ہیں۔
پرندے چھتوں سے ایک لمحے کو نیچے نظر ڈالتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔
رات، پڑوس کے میخانے میں بیٹھے گورکی
کھاتے ہیں، پیتے ہیں، گاتے ہیں،
اندھیرے گڑھوں سے بھرا گیت۔
گڑھوں میں سے ہلکی ہلکی ہوا چلنی شروع ہوتی ہے۔
پتے اور روشنیاں تھرتھراتی ہیں۔
اس کے شیلف میں بچھا کاغذ بھی تھرتھراتا ہے۔

اجنبی خطّوں میں

وہ چاروں جانب دیکھتا ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔
دور، شاں دار غروبِ آفتاب۔ وہ باغ کے جنگلے کو پہچان لیتا ہے۔
دروازے کے دستے کو، کھڑکیوں کو، سرو کے درخت کو۔

مگر وہ خود؟
ایک شانت جھیل کا عکس بہت اوپر بادل میں پڑ رہا ہے،
گلابی جھیل، سنہری کناروں والی۔
وہاں اوپر اس نے اپنے جوتے اور کپڑے چھوڑ دیے ہیں۔
اب وہ یوں برہنہ راستے کے بیچوں بیچ کس طرح کھڑا رہے؟
یوں برہنہ وہ کس طرح ایک اجنبی مکان میں داخل ہو جائے؟

احساس کی پرتیں

گلابی نارنجی سورج ڈوب چکا۔ سمندر تاریک، گہرا سبز۔ بہت دور ایک کشتی۔
ایک سیاہ، ہلتا ہوا نشان۔ کوئی اپنی جگہ سے اٹھا اور چلّایا، "کشتی! کشتی!"
قہوہ خانے میں سب نے اپنی کرسیاں چھوڑ دیں اور دیکھا،
واقعی ایک کشتی تھی۔
مگر وہ جو چلّایا تھا، جیسے اب دوسروں کی درشت نظروں کی زد میں،
خجل ہوکر نیچے دیکھنے لگا اور دھیمی آواز میں بولا،
"میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔"

رِشتہ

اس نے کہا، لنگر!
لنگر ڈالنے کے مفہوم میں نہیں، نہ سمندر کے کسی حوالے سے۔
وہ تو لنگر کو اپنے کمرے میں اٹھا لایا اور فانوس کی طرح چھت کی کڑی سے لٹکا دیا۔
رات کے وقت بستر پر لیٹ کر اس نے چھت کے بیچوں بیچ اس لنگر پر نظر ڈالی،
اور جانا کہ اس کی زنجیر چھت کے پار سیدھی اوپر بڑھتی چلی گئی ہے
اور اس کے سر سے بہت اوپر، کسی پُرسکون سطح پر،
ایک بڑی سی اندھیری کشتی کو تھامے ہوئے ہے۔
کشتی کی بتّیاں بجھی ہوئی تھیں۔
کشتی کے عرشے پر ایک مفلس موسیقار نے
اپنا وائلن غلاف سے نکالا اور بجانے لگا۔
اور وہ ایک متوجّہ مسکراہٹ کے ساتھ اس موسیقی کو سنتا رہا،
جو چاندنی اور سمندر میں سے گزر کر اس تک پہنچ رہی تھی۔

Scanned with CamScanner

راتیں، زبردست طوفان۔
تنہا عورت لہروں کو سیڑھیاں چڑھتے سنتی ہے۔
اسے خوف ہے وہ دوسری منزل تک چڑھ آئیں گی۔
چراغ بجھا دیں گی، دیاسلائی گیلی کر دیں گی، بستر تک پہنچ جائیں گی۔
تب سمندر میں چراغ ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کے سر کی طرح ہو گا۔
جس میں صرف ایک زرد خیال ہو۔
یہ خیال اسے بچا لیتا ہے۔ وہ لہروں کو اترتے سنتی ہے۔
میز پر رکھے چراغ کو دیکھتی ہے!
اس کے شیشے پر جمی ہوئی ہے نمک کی پلکی سی تہہ۔

کوزہ گر

ایک روز جب وہ گھڑے، گلدان اور برتن بنا چکا تو کچھ مٹی باقی رہ گئی۔
اس نے بھاری اور سخت چھاتیوں والی ایک عورت بنائی۔
اس کا ذہن بھٹکنے لگا۔ وہ دیر سے گھر لوٹا۔
اس کی بیوی بڑبڑانے لگی۔ وہ جواب میں کچھ نہ بولا۔
اگلے روز اس نے اور مٹی بچائی، اور اس سے اگلے روز اس سے بھی زیادہ۔
وہ گھر نہ لوٹا۔ اس کی بیوی اسے چھوڑ گئی۔
اس کی آنکھیں جلتی ہیں۔ وہ نیم برہنہ ہے۔ اس نے کمر کے گرد ایک سرخ پٹکا باندھ رکھا ہے۔
وہ رات بھر مٹی کی عورتوں کے ساتھ لیٹا رہتا ہے۔
صبح سویرے تم اسے کارگاہ کے جنگلے کے پیچھے سے گاتے ہوئے سن سکتے ہو۔
اس نے اپنی کمر کا سرخ پٹکا بھی اتار دیا ہے، بالکل برہنہ!
اور اس کے چاروں طرف ، خالی گھڑے، خالی گلدان، خالی برتن،
اور جیتی ہوئی چھاتیوں والی
خوب صورت، اندھی، گونگی، بہری عورتیں۔

ضروریات

وہ بڈھے پن سے اپنے کوٹ کا بٹن ٹانکتا ہے ،
موٹی سی سوئی سے، موٹے سے دھاگے سے۔

وہ خود سے باتیں کرتا ہے

تم نے روٹی کھا لی؟ تم اچھی طرح سوئیں؟
کیا تم میں بولنے، بازو پھیلانے کی سکت رہی؟
کیا تمھیں کھڑکی سے باہر دیکھنا یاد رہا؟
کیا تم دروازے پر دستک سن کر مسکرائیں؟

اگر یہ موت ہے، تو یہ بعد میں آتی ہے۔
آزادی ہمیشہ پہلے آتی ہے۔

احتیاط

شاید اب بھی تمھیں اپنی آواز پر قابو رکھنا ہے۔
کل، پرسوں، جب بھی
لوگ جھنڈوں کے نیچے چلّائیں
تو تمھیں بھی چلّانا ہے۔
لیکن خیال رکھنا کہ ٹوپی تمھاری آنکھوں پر جھکی رہے،
نیچے جھکی رہے،
تاکہ وہ یہ نہ جان سکیں کہ تمھاری آنکھیں کس طرف دیکھ رہی ہیں،
چاہے تم یہ جان بھی لو کہ وہ، جو چلّا رہے ہیں،
کہیں بھی نہیں دیکھ رہے۔

پائیریس کے قیدیوں کا ٹرانسپورٹ سیکشن

آدھا کمبل نیچے، آدھا اوپر۔ بخار، سیمنٹ، جلن۔
بالوں میں پسینا، دیوار پر ناخنوں سے کھودے ہوئے نقوش،
نام، تاریخیں، چھوٹی چھوٹی بازیاں، وہی کابوس!
کھلتے دروازوں میں دبی ٹارچیں، "آج، آج رات"
"کل، کل صبح"۔ ہمیں یاد رکھنے کو یہاں کون رہ جائے گا؟
جب چابی کے تالے میں گھومنے کی آواز آئے گی اور لمبی زنجیر
بیزانت سفید راستے پر گھسٹتی جائے گی،
جہاں ایک کونے میں

منتظر

راہداری میں کھڑی غمگین عورت۔ وکیل۔ پہریدار۔
فرش پر کمبل رسیوں سے بندھا پڑا تھا۔
جیلر کے دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ "چار بجے"۔
وہ کہہ رہے تھے۔ "کشتی چار بجے"۔ "ٹھیک چار بجے"۔
فولادی دروازہ پھر چرچرایا۔ وہ اور لوگوں کو اندر لے رہے تھے۔
"میں تمہیں سگریٹ بھیجوں گی"۔ عورت کہہ رہی تھی۔
"بس ختم" پہریدار نے کہا۔
دیوار پر بڑی سی چھپکلی رینگ رہی تھی۔
ایک دم دوسرا دروازہ کھلا۔ مرا ہوا آدمی منہ کھولے اندر آیا۔
دوسرے نے جھپٹ کر چھپکلی کو پکڑ لیا۔ اپنے منہ میں ڈال لی۔
وہ جنگلے پھینچے ہنسنے لگا۔
"بولو" انہوں نے چلا کر کہا "بولو"
"بولو" انہوں نے دھمکایا۔ وہ ایک لفظ نہ بولا۔ منہ بند کیے بیٹھا رہا۔
عورت نے بندھے ہوئے کمبل پر بیٹھ کر
بالوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

سزائے موت کا منتظر

صبح منہ اندھیرے۔ دیوار کے ساتھ کھڑا۔ آنکھوں کی پٹی اتاری۔
بارہ بندوقوں کو اپنی سمت رخ کیے دیکھتا۔
وہ خود کو جوان اور طرحدار پاتا ہے۔ شیو کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہے
اور خود کو دور کا ہلکا گلابی افق جذب ہے۔
اس کے اعضائے تناسل کا وزن کم نہیں ہوا
ایک پُرحرارت اداسی۔ خواجہ سراؤں کی نگاہیں اسی پر ہیں۔
ان کا نشانہ بھی اسی جانب ہے۔
کیا وہ خود اپنا مجسمہ بن چکا ہے؟ خود اس کی برہنگی پر نظر ڈالتا
یونان کی گرمیوں کے ایک روشن دن میں
ہجوم کے کندھوں کے پیچھے سے

مشکوک

اس نے دروازے کو تالا لگایا۔ مشکوک انداز سے اپنے پیچھے نگاہ ڈالی۔
اور چابی جیب میں رکھ لی۔ اسی وقت اسے گرفتار کر لیا گیا۔
وہ مہینوں اس پر تشدد کرتے رہے۔
آخر ایک شام اس نے اعتراف کر لیا (جسے ثبوت مانا گیا)
کہ وہ چابی اور وہ گھر اسی کی ملکیت تھے۔
لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے چابی کو چھپانے کی کوشش کیوں کی تھی۔
اور اس طرح اپنی برئیت کے باوجود وہ ان کے لیے ایک مشکوک شخص ہی رہا۔

وہی رات

جب اس نے اپنے کمرے کی بتی جلائی، وہ ایک دم جان گیا
کہ وہ وہی ہے، اپنی جگہ میں۔
رات کی بیکناری اور اس کی لمبی شاخوں سے کٹا ہوا۔
اس نے آئینے کے سامنے جا کر اپنی تصدیق کی۔
لیکن یہ چابیاں کیسی تھیں
جو ایک غلیظ دھاگے میں بندھی اس کی گردن سے لٹک رہی تھیں؟

تلاشی

اندر چلے آؤ دوستو -- اس نے کہا --
زحمت کی کوئی بات نہیں۔ ہر چیز دیکھ لو۔ میرے پاس چھپانے کو کچھ نہیں۔
یہ خواب گاہ ہے، یہ مطالعے کا کمرہ، یہ کھانے کا کمرہ۔
یہ؟ یہ پرانی چیزوں کا چوبارہ۔ یہ گھسی ہوئی چیزوں سے بھرا پڑا ہے۔
ہر چیز گھس کر پرانی ہو جاتی ہے دوستو، اور کس قدر جلد؟
یہ؟ یہ انگوٹھی ہے۔ ماں کی۔
یہ؟ ماں کا چراغ۔ ماں کی چھتری۔ وہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھی۔
لیکن یہ جعلی شناختی کارڈ؟ یہ چوری کے زیور؟ یہ گندا تولیہ؟

rekhta

Scanned with CamScanner

اور یہ اس شخص کی تصویر؟ پھولوں سے ڈھکا زنانہ ہیٹ پہنے
کسی اجنبی کو تحفے میں دی ہوئی تصویر؟ اس کی اپنی تحریر؟
یہ سب یہاں کون لایا؟ یہ سب یہاں کون لایا؟ یہ سب یہاں کون لایا؟

نیند سے پہلے

اس نے صفائی کی، برتن دھوئے، ہر چیز خاموش ہے۔ گیارہ بج گئے۔
اس نے سونے کے لیے اپنے جوتے اتارے۔
وہ بستر پر نہیں جا رہی، وہ بستر کے پہلو میں کھڑی ہے۔
کیا وہ کچھ بھول گئی ہے کہ اس کا دن ختم ہونا نہیں چاہتا؟
... کمرہ کچھ ٹھیک نہیں ہے، نہ بستر، نہ میز...
انجانے میں وہ اپنی اسٹاکنگ لیمپ کے سامنے لاتی ہے
سوراخ ڈھونڈنے کے لیے۔
اسے کوئی سوراخ دکھائی نہیں دیتا۔
پھر بھی اسے یقین ہے کہ سوراخ ہے، شاید دیوار میں یا شاید آئینے میں،
جس میں سے اسے رات کے خرّاٹے لینے کی آواز سنائی دے رہی ہے
بستر پر اسٹاکنگ کا سایہ ایسا ہے
جیسے سرد پانی میں کسی اندھی زرد مچھلی کے راستے میں آیا ہوا جال۔

چہرہ یا مجسمہ

میں نے پتھر کا یہ مجسمہ تراشا ہے .. اس نے کہا ..
ہتھوڑی سے نہیں، اپنی ننگی انگلیوں سے، اپنی ننگی آنکھوں سے، اپنے ننگے جسم سے،
اپنے ہونٹوں سے۔ اور اب میں نہیں جانتا کہ میں کون ہوں اور یہ مجسمہ کون۔
وہ اس کے پیچھے چھپ گیا۔
وہ بےحد بدہیئت تھا۔ وہ مجسمے سے لپٹ گیا۔
اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا۔
اور وہ ساتھ چلنے لگے۔
اور تب اپنی حیرت میں اس نے لوگوں کو بتایا
کہ شاید یہ مجسمہ وہ خود ہے۔

[illegible]
مگر اس کی بات پر یقین کون کرتا ہے؟

یاد

اس زنانہ اوورکوٹ کی بغلوں میں ایک گرم مہک باقی رہ گئی تھی۔
وارڈروب میں لٹکا اوورکوٹ ایک کھنچے ہوئے پردے کی طرح تھا۔
اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ کسی اور وقت میں ہوا۔
روشنی نے چہرے تبدیل کر دیے، سب آ جاتے۔
اور اگر کوئی مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا
تو یہ خالی اوورکوٹ آہستہ سے اپنا بازو اٹھاتا، اور تنبیہ سے، خاموشی سے
دروازہ پھر بند کر دیتا۔

دستک

نمک، دھوپ اور سمندر مکانوں کو آہستہ آہستہ کھا جاتے ہیں۔
جہاں کبھی کھڑکیاں تھیں اور لوگ تھے، وہاں گیلے پتھر باقی رہ گئے ہیں۔
اور ایک مجسمہ جس کا چہرہ ریت میں دھنسا ہوا ہے۔
دروازے، اکیلے، سمندر پر تیرتے ہیں، سخت، بےمصرف، عجیب۔
کبھی کبھار غروب کے وقت تم انہیں پانی پر چمکتا دیکھتے ہو،
سپاٹ، ہمیشہ کے لیے بند۔
مچھیرے ان کی طرف نہیں دیکھتے۔ وہ صبح کاذب کے وقت تک
اپنے مکانوں میں تیل کے چراغوں کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔
انہیں اپنے جسموں کی درازوں میں مچھلیوں کے گھسنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔
انہیں اپنے جسموں پر سمندر کے انجانے ہاتھوں کی دستک سنائی دیتی ہے۔
تب وہ سو جاتے ہیں
اپنے بالوں میں پھنسی سیپیوں کے ساتھ۔
اچانک انہیں ان دروازوں پر دستک سنائی دیتی ہے،
وہ جاگ پڑتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

ب -- وہ کہتا ہے -- میں مچھلیاں پکڑنے نہیں جاتا،
یہاں قہوہ خانے میں بیٹھا رہتا ہوں۔ کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہوں۔
جہاں مچھیرے اپنی ٹوکریاں لیے اندر آتے ہیں۔
وہ بیٹھے ہیں، پیتے ہیں، باتیں کرتے ہیں۔
میں سوچتا ہوں، انھیں بتا دوں
کہ شراب کے گلاسوں میں سے مچھلیاں اور طرح چمکتی ہیں۔
اور اس بڑی مچھلی کے بارے میں، جس کی پیٹھ میں ایک برچھی گڑی ہوئی ہے،
اور غروب کے وقت سطح پر اس کے لمبے سائے کے بارے میں۔
میں انھیں کچھ نہیں بتاتا۔
انھیں ڈولفنوں سے محبت نہیں ہے۔
اور کھڑکی کے شیشے نم ہوا سے دھندلا گئے ہیں۔
نہیں، صفائی کی ضرورت ہے۔

○○○○○○

(یونانی)
انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

Anton Shammas

انطون شمّاس

انطون شمّاس کی یہ تحریر دراصل ایک لیکچر ہے جو انھوں نے ۵ مارچ ۱۹۹۰ کی شب وسکانسن یونیورسٹی کے میڈیسن کیمپس پر دیا۔ اس رات بڑی دیر تک اس لیکچر کا ایک جملہ میرے ذہن میں کھٹکتا رہا: "تو کیا اس سے اس بات کی وضاحت نہیں ہو جاتی کہ ایک اوسط درجے کا جدید عبرانی ناول ایک اوسط درجے کے عربی ناول سے کیوں بدرجہا بہتر ہوتا ہے؟" "عربی ناول" کی جگہ اگر "اردو ناول" رکھ دیں، میں نے سوچا، تو کیا کوئی بڑا لمبا چوڑا فرق پڑ جائے گا؟ ...

اس لیکچر کے بعض اور مطالب بھی مجھے کافی چلبلے محسوس ہوئے؛ مثلاً یہ کہ قصے کہانی کا انحصار "حافظے" پر ہوتا ہے اور فکشن کا "تخیل" پر؛ کہ ناول فرد کی تنہائی میں جنم لیتا ہے؛ کہ بیانیہ ادب کے لیے "زبانیت" (orality) سے "خواندگی" (literacy) کی طرف حرکت ناگزیر ہے۔ آخراً یہ بھی کہ مشرقی فنِ قصہ گوئی، جس کی روشن ترین مثال، بلکہ معراج "کتاب الف لیلہ و لیلہ" ہے، آج بھی اس فن کے رموز کے بارے میں ہمیں دو ایک پتے کی باتیں سکھا سکتی ہے۔ (آپ کو انتظار حسین کے خیالات کی بازگشت سنائی دی؟) بلکہ "الف لیلہ" کے بارے میں ایک تازہ کار نظر کی ضرورت کا احساس تو ان دنوں -- براہِ راست یا کنایتاً -- تودورف، بورخیس، کارلوس فوینٹیس، اور میلان کنڈیرا کے یہاں بھی ملتا ہے۔ (کنڈیرا صاحب، چونکہ تمدنی تعصّب کا شکار ہیں، بات سروانتیس سے شروع کرتے ہیں اور اس میں اسٹرن، رابلے وغیرہ کے نام اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں)۔

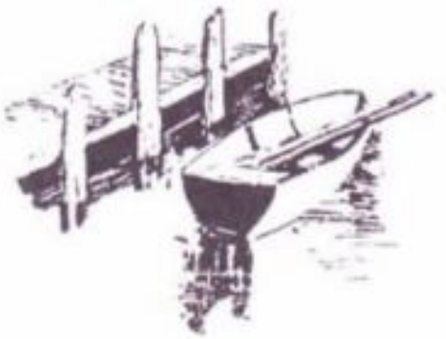

ہوتا ہے اور یہ کہ اس سے انتظار حسین کے بعض مفروضات کی تائید بھی ہوتی ہے، میں نے اس کو ترجمہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلی صبح، ناشتے پر، جب میں نے انطون سے اپنے ارادے کا ذکر کیا تو انھوں نے بہ خوشی اجازت دے دی۔

انطون شمّاس ۱۹۵۰ میں فسوطہ، الجلیل (اسرائیل) میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک فلسطینی/اسرائیلی ادیب ہیں جو عبرانی بھی اسی سہولت سے لکھتے ہیں جس سے عربی۔

انھوں نے ہیبرو یونیورسٹی (یروشلم) میں عربی اور انگریزی زبان اور ادبیات، نیز آرٹ ہسٹری کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۰ سے ۱۹۷۵ تک یروشلم سے نکلنے والے عربی کے ادبی ماہنامے "الشرق" کے شریک مدیر رہے؛ ۱۹۷۶ سے ۱۹۸۶ تک اسرائیلی ٹیلی وژن (یروشلم) میں عربی کے ادبی پروگراموں کے پروڈیوسر رہے؛ ۱۹۸۲ سے ۱۹۸۷ تک فری لانس صحافی اور ہفت وار کالم نویس کی حیثیت سے عبرانی کے اخبار "کول هاعیر" (یروشلم) اور "هاعیر" (تل ابیب) سے متعلق رہے۔ ۱۹۸۱ کی خزاں آیووا سٹی میں گذاری، جہاں آیووا یونیورسٹی کے انٹرنیشنل رائٹنگ پروگرام سے متعلق رہے۔ (یادش بہ خیر! اس سے ٹھیک دو سال پہلے، قرۃ العین حیدر بھی اسی پروگرام میں شمولیت کے لیے آئی ہوئی تھیں)۔ ۸۸ ـ ۱۹۸۷ کا تعلیمی سال یونیورسٹی آف مشی گن کے دراساتِ مشرقِ قریب کے مرکز میں روکافیلر ریزیڈنٹ کی حیثیت سے گذارا؛ اس سے اگلا سال یہاں وزٹنگ فیلو اور انسٹیٹیوٹ آف ہیومینیٹیز میں لیکچرر کی حیثیت سے، اور ۹۰ ـ ۱۹۸۹ کے تعلیمی سال کے دوران اسی یونیورسٹی کے انگریزی اور دراسات مشرقِ قریب کے شعبوں میں ایڈجنکٹ پروفیسر رہے۔

انطون شمّاس کے اب تک تین شعری مجموعے چھپ چکے ہیں؛ "اسیر یقظتی و نومی" جو عربی نظموں پر مشتمل ہے اور ۱۹۷۴ میں شائع ہوا؛ اور "کریخاہ کشاہ" اور "شیطح هفکیر" جو عبرانی میں ہیں اور علی الترتیب، ۱۹۷۴ اور ۱۹۷۹ میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ انطون نے عبرانی میں ایک کتاب بچوں کے واسطے بھی لکھی ہے۔

لیکن مغرب، بالخصوص امریکا، میں انطون شمّاس کی شہرت کا دارومدار ان کے عبرانی ناول Arabesques (مطبوعہ ۱۹۸۶) کے انگریزی ترجمے پر ہے جو ہارپر اینڈ رو نے اوائل ۱۹۸۸ میں نیویارک سے Arabesques کے عنوان کے تحت شائع کیا۔ اس ناول کو ایک چھوٹا موٹا فکشنی معجزہ کہنا چاہیے ("چھوٹا موٹا" صرف اس اعتبار سے کہ ہم زمانی طور پر اس سے قریب ہیں؛ اور کسی ادبی کارنامے کی صحیح قدروقیمت کا اندازہ معاصر سیّد جیّد نقادوں کی گھن گرج سے زیادہ اس تناظر اور بصیرتوں کی اس دھیمی روشنی ہی میں کیا جا سکتا ہے جو وقت کے گذران کے ساتھ ہم تک ہولے ہولے پہنچتی ہے)۔

انطون شمّاس نے بیکٹ، فوغارد، امیل حبیبی، افراهم یهوشواع، عاموس عوز، یہودا عمیحای اور بعض دوسرے ادیبوں کی نگارشات کا عربی اور عبرانی میں ترجمہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں، ان کی اپنی متفرق تحریریں -- مثلاً جیسے فکشن، کتابوں پر تبصرے، اور مشرقِ وسطیٰ کے معاصر سیاسی اور ثقافتی منظرنامے سے متعلق مضامین -- مختلف اخباروں اور رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں: "گرانٹا"، "دی نیویارک ریویو آف بکس"، "ہارپرز"، Tikkun ، "لاس اینجلیز ٹائمز"، اور "دی نیویارک ٹائمز بک ریویو"۔

مضمون میں وارد ہونے والے قرآن شریف اور بائبل کے اقتباسات کا اردو ترجمہ، علی الترتیب، "القرآن حکیم"، مع ترجمہ و تفسیر از مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی (لاہور اور کراچی: تاج کمپنی لمیٹڈ، ۱۹۵۲)، اور "کتابِ مقدّس، یعنی پرانا اور نیا عہدنامہ"، (لاہور: برٹش اینڈ فارن بائبل سوسائٹی، ۱۹۵۶) سے مستعار ہے۔ جہاں کوئی لفظ یا فقرہ وضاحتاً بڑھانا پڑا ہے تو وہ قوسین کے اندر بڑھایا ہے۔ حواشی مترجم نے اپنی طرف سے اضافہ کیے ہیں۔

محمد عمر میمن

انطون شمّاس

عربی، عبرانی اور قصّہ گو کی قمیص

مجھ جیسے کسی شخص کو -- جو قصہ کو بننے کے عمل میں ہو؛ تیسری دنیا سے بہ زعمِ خود، نئی دنیا کی طرف آیا ہو -- ثقافتی اعتبار سے تہ و بالا کرنے کے لیے روزمرّہ کی یہ امریکی حقیقت ہی کافی ہے کہ یہاں قمیص کی گردن ہی کا نہیں بلکہ آستیں کا ناپ بھی ہوتا ہے۔ میں جس کلچر سے آ رہا ہوں، وہاں، جہاں تک قمیصوں کا تعلق ہے، آدمی کی گردن کے ناپ تک کی سرے سے کوئی حقیقت نہیں ہوتی؛ بازوؤں کی لمبائی کا تو خیر ذکر کیا۔ مشرق وسطیٰ کے لوگ، جیسا کہ آپ نے ملاحظہ کیا ہو گا، ہنوز اپنی سرحدوں -- ذاتی اور ماسوا -- کے طول و عرض کو بوجھنے میں غرق ہیں؛ اور جملہ آثار یہی کہہ رہے ہیں کہ ایک طویل مدت گذرنے کے بعد ہی کہیں جا کر انھیں اپنی آستیں کے ناپ کے بےکیف شغل کی طرف متوجہ ہونے کا موقع مل سکے گا، اس شغل کی حیثیت اب جو کچھ بھی ہو۔

چند ماہ قبل رُشدی سے متعلق "نیوزویک" کی کوَر اسٹوری کے مطالعے کے بعد، یہ شاید بال کی کھال نکالنے -- یا بلکہ یوں کہیے، قمیص کے لتّے لینے -- کے اَرفع و مُنزّہ فن میں رنگ رلیاں منانے کے مترادف معلوم ہو، خاص طور پر اس وقت جب رشدی کے سے کہنہ مشق قصہ گو نے سال سے اوپر ہوا چاہتا ہے کہ اپنی گردن باہر کر دی ہے، اور یوں بےچارے قصہ گو کی دُر دَشا کو ایک دردناک معنی پہنا دیے ہیں؛ یہی کہ قصہ گوئی کی گرم و گداز (ہرچند کہ چند روزہ اور گریزاں) دنیا سے، خون سرد کر دینے والی خارجی حقیقت کی دنیا میں (جو متن کے باہر منڈلا رہی ہے) اپنی گردن نکالنا، تاکہ کوئی شخص پھندے کا درست ناپ معلوم کرنے کے واسطے آپ کی گردن کا ناپ لے ڈالے۔ تاہم، اگر آدمی رُشدی کے حالِ زار کی تاریخ کا حسبِ ضرورت تفحّص کرے، تو عجب نہیں جو وہاں، قدیم مشرق قریب (Near East) کے پس منظر کے طور پر، اسے ایک قمیص مل جائے، ایک خون آلود قمیص۔

ہے، انھیں شاید یاد ہو گا کہ حضرت عثمان کا قتل جون ۶۵۶ میں ہوا۔ یہ تیسرے خلیفہ تھے اور قرآن شریف کا مستند اور تحریری نسخہ انھیں کی ایما پر تیار ہوا تھا۔ اس واقعے کے بعد معاویہ نے (جو آئندہ اُموی سلسلے کے پہلے خلیفہ بننے والے تھے) حضرت عثمان کی خون آلود قمیص کی دمشق میں نمائش کی تاکہ علی بن ابی طالب کو بےاعتبار کیا جا سکے۔ موخرالذکر کا شمار اسلام کے نادرترین اذہان میں ہوتا ہے، اور یہ گویا شیعوں کے جدِ امجد تھے۔ (برسبیلِ تذکرہ -- محض آپ کو یہ دکھانے کے لیے کہ تاریخ اپنی چالیں کس طرح چلتی ہے -- "رینڈم ہاؤس ڈکشنری" کی دوسری طباعت میں ان کا ذکرِ خیر دیگر چار عدد علیوں کے ساتھ ہوا ہے، جن میں آخری ہمارے نسبتاً زیادہ معروف ہیوی ویٹ چیمپیین ہیں۔) وہ قصّہ جو معاویہ نے اس خون آلود قمیص کے گرد بُنا، ظاہراً مہلک ترین اسلامی قصّوں میں سے ایک تھا۔ یوں "قمیصِ عثمان"، خواہ یہ خون آلود ہو یا نہ ہو، ایک استعارہ بن گئی۔ چنانچہ -- اور ایک مخصوص زہرخندانہ (sardonic) معنی میں، جس میں مشرقی تخیّل کی مساوی مقدار شامل کر لی جائے تو -- آدمی کہہ سکتا ہے کہ رُشدی اس خون آلود قمیص کے قصّے کا ایک اور دیررسیدہ شکار ہے۔

قمیصیں کرتے، مشرقِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک خاصا اہم کردار انجام دیتے رہے ہیں، یعنی اگر آپ اپنے تخیّل کے چرخے کو حسبِ ضرورت متحرّک کرنے کے واسطے تیار ہوں۔ ان میں، بدیہی طور پر، مشہور ترین، بائبل کا جوزف/یوسف کا "کتونیت پسّیم" (ketonet-passim) یعنی "دھاری دار کرتا" ہے؛ یوسف، وہی من موہنی، سہانے سپنے دیکھنے والا، یعقوب کا لاڈلا نورِ چشم؛ اور وہی دھاری دار لمبی لمبی آستینوں والا کرتا، یا "مرصّع چوغہ" (ornamented tunic) جو بائبل کے کنگ جیمز کے ورژن تک آتے آتے، "بوقلموں قبا" (coat of many colours) میں بدل چکا تھا ("آفرینش"، ۳:۳۷)۔

عیسائیوں کے بھی اپنے قمیصیں کرتے ہیں، خاص طور پر اگر ہم لفظ کو وسیع معنی میں لیں -- یعنی ایک دقیانوسی لبادہ جو گٹّوں تک گھسٹتا چلا آتا ہو، یا کم از کم جس طرح ہالی وڈ کی فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ رومی سپاہ نے -- رومن کیتھولک بننے سے قبل (افسوس!)، اور عیسیٰ کو مصلوب کرنے کے بعد (اگر ہم یوحنّا، یکے از مولّفینِ انجیل، کو معتبر خیال کریں جو بظاہر موقعِ واردات پر موجود تھا) -- عیسیٰ کے کپڑے چار حصّے کیے تاکہ ہر سپاہی کو ایک حصّہ مل سکے۔ اور تو اور، انھوں نے -- یا عجبا! -- ان کا کرتا بھی لے لیا۔ اب جناب، یہ کرتا بےسِلا اور سراسر بُنا ہوا تھا۔ اس لیے انھوں نے آپس میں کہا، "اسے پھاڑیں نہیں بلکہ اس پر قرعہ ڈالیں تاکہ معلوم ہو کس کا نکلتا ہے"۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ نوشتہ پورا ہو جو کہتا ہے کہ "انھوں نے میرے کپڑے بانٹ لیے اور میری پوشاک پر قرعہ ڈالا" (یوحنا"، ۲۳ - ۱۹/۲۴)۔

ملاحظہ کیجیے کہ راوی نے جو محلِ جرم پر موجود تھا، اپنی قمیص اپنے تن پر جوں کی توں رہنے دی اور ذرا بھی تو آپے سے باہر نہ ہوا۔ جب رومی سپاہ عیسیٰ کے کرتے پر اپنی اپنی قمیصوں کی شرط بَد رہے تھے تو دریں اثنا راوی -- جس کا کہنا ہے کہ عیسیٰ اسے "محبوب"

یقیناً بےحد کریہہ اور بھیانک رہا ہو گا، رخ پھیرے ایک الوہی پوکر کے کھیل کی طرف ہمہ تن متوجہ۔ اچانک اتنے میں اس قصے کے سامع/قاری کی توجہ کپڑاسازی کے اس امرِ واقعہ کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ کرتا بےسِلا تھا۔ یہ ایک ایسی تفصیل ہے جو ہمارے مشاہدے میں سرے سے نہ آتی، اگر ہمارا سابقہ ایک عظیم قصّہ گو سے نہ پڑا ہوتا، بلکہ ایک کہنہ مشق قصہ گو کہیے، ایک ایسا ہی کہنہ مشق جس کا نقشہ ڈبلیو - ایچ - آڈن (W.H. Auden) نے اپنی نظم "فنونِ جمیلہ کا میوزیم" (Muse des beaux arts) میں کھینچا ہے:

About suffering they were never wrong,
The Old Masters: how well they understood
Its human position; how it takes place
While someone else is eating or opening a window or just walking dully along;
How, when the aged are reverently, passionately waiting
For the miraculous birth, there always must be
Children who did not especially want it to happen, skating
On a pond at the edge of the wood:
They never forgot
That even the dreadful martyrdom must run its course
Anyhow in a corner, some untidy spot
Where the dogs go on their doggy life and the torturer's house
Scratches its innocent behind on a tree.

برسبیلِ تذکرہ، "کتاب الف لیلہ و لیلہ" میں ایسے اَن گنت اور طویل نثری پارے موجود ہیں جن میں نہایت دیدہ ریزی اور تفصیل کے ساتھ کسی قیمتی کپڑے، زیور یا کسی خوابی محل کے سنگِ مرمر کے فرش کا ذکر ملتا ہے، اور پھر نہایت اختصار کے ساتھ محض چند سطروں میں ایک بھیانک قتل کا مختصر ترین بیان؛ اور پھر، جیسے کچھ بھی تو نہ ہوا ہو، کہانی جاری رہتی ہے؛ "...اور شہرزاد نے یہ محسوس کرتے ہی کہ پَو پھٹنے والی ہے، قصہ گوئی بند کی"، تاآنکہ اگلے دن، "یہ بات مجھ تک پہنچی ہے، اے بھاگوان بادشاہ..."

دوسری طرف، آپ سخت متعجّب ہو رہے ہوں گے، اور بجا طور پر، کہ میں جو یہ قمیص کا قصّہ لے بیٹھا ہوں تو اس کا عربی اور عبرانی سے کیا تعلق ہے؟ بات یہ ہے کہ جوزف/یوسفِ بانام، بلا کرتا یا باکرتا، کم از کم اتنا گویا ضرور ہے کہ ہمیں جواب فراہم کر دیتا ہے۔ اپنی مطلب براری کے واسطے میں یہاں بائبل کے جوزف اور قرآنی یوسف دونوں سے کام لے رہا ہوں، کیوں کہ قرآن کی جملہ سورتوں میں صرف "سورتِ یوسف" ہی ایک مکمل بیانیے کا درجہ رکھتی ہے؛ اور یہ بظاہر سارے عربی ادب میں قدیم ترین نوشتہ/محرّر (written) بیانیہ ہے؛ نہ صرف یہ بلکہ منطقی اعتبار سے مربوط، قدیم ترین عربی نوشتہ بیانیہ ہے جس کی ایک ملتی جلتی نظیر

rekhta

Scanned with CamScanner

خیال میں، بہت کافی وجہ ہے۔)

میں یہ قصہ آپ کو نہیں سناؤں گا۔ اس کی دو وجہیں ہیں؛ اوّل تو یہ کہ آپ میں سے سبھی، یا زیادہ تر اصحاب اس سے واقف ہوں گے۔ دوم، بعض خالص خودغرضانہ وجوہ کی بنا پر، جو امید ہے اس گفتگو کے دوران خود بہ خود آپ پر واضح ہو جائیں گی، میں فی الواقع، ذہبی ذہبی سی اس یادداشت کو آپ کی ذہنی کیفیت کے لیے ترجیح دیتا ہوں۔ چنانچہ میں قصّے کی بعض دلچسپ تفصیلات ہی کو اجاگر کرنے پر اکتفا کروں گا۔

بائبل کے بیانیے کے یہ نظرِ غائر مطالعے سے یہ عیاں ہو جاتا ہے -- اور یہ بات "کتاب آفرینش" کے بیشتر بیانیوں پر صادق آتی ہے -- کہ جب آٹھویں صدی قبل مسیح میں کسی وقت بائبل کا مولّف (editor/redactor) اسے مدوّن کرنے بیٹھا تو اس وقت اس کے سامنے قصّے کی دو روایتیں تھیں، روایت یا ورژن "جے" اور روایت "ای" جو، علی الترتیب، "یہوہ" (Jahveh) اور "ایلوہیم" (Elohim) کے یا (کنگ جیمز ورژن کے مطابق) "لارڈ" (Lord) اور "گاڈ" (God) کے قائم مقام ہیں۔ صرف اسی طرح ہم، مثلاً، اس ابہام کی وضاحت کر سکتے ہیں جو جوزف کے پہلے اشماعیلیوں (Ishmeelites) کے ہاتھوں فروخت ہونے اور بعد ازاں، ایک سطر آگے، مدیانیوں (Midianites) کے ہاتھوں پہلے تاریک گڑھے سے نکالے جانے اور بعد میں اشماعیلیوں کو فروخت کر دیے جانے میں پایا جاتا ہے۔

دو زبانی روایتیں قدیم مشرقِ قریب میں صدیوں سے چکراتی پھرنے کے بعد کاغذ یا چرمی کاغذ پر تحریر میں آئیں (بائبل کے رڈیکٹر کے توسط سے) اور یوں مل ملا کر ایک واحد بیانیے میں مجسّم ہو گئیں۔ یہ بیانیہ، مناسب وقت گذرنے پر بجائے خود ایک مستقل زبانی روایت بن گیا۔ ظاہری طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ قصّہ جوزف کا محرّرہ متن زبانی طور پر مدوّن اور زبانی طور پر روایت کردہ دو بیانیوں کا نقطۂ اتصال تھا۔ مابعد یہ مسلسل اور متواتر پڑھا گیا -- یہ ملحوظ رہے کہ ان دنوں پڑھنے سے مراد بہ آواز بلند ادا کرنا (بلند خواندگی) ہوا کرتا تھا -- تاآنکہ اسے ادائیگی کی ایک اور سطح حاصل ہو گئی، یعنی زبانی۔ یہ زبانی ادائیگی، اپنی ایک مخصوص روایت میں قرآن میں راہ پا گئی۔

قرآنی "سورتِ یوسف" (نمبر ۱۲) اپنے قصّہ یا کہانی ہونے کا اعلان خود ہی کرتی ہے؛ "ہم ہی اس کے (قرآن کے) ذریعے سے آپ سے ایک بہترین قصّہ بیان کرتے ہیں"۔ ("نحن نقصّ علیک أحسنَ القصص"؛ سورت ۱۲، آیت ۳)؛ اور یہ ایسا دعوا ہے جو قرآن کی عام روش سے میل کر ہے۔ یعنی قرآن ہمیں اس قصّے کو ایک بیانیے کی حیثیت سے برتنے کی دعوت دیتا ہے، محض ایک سبق آموز اور ناصحانہ بیان (discourse) کی حیثیت سے نہیں۔

میں یہاں اس قضیے میں نہیں پڑنا چاہتا کہ قصّہ یوسف کا مصنّف کون ہے اور اس کا راوی کون، یعنی تیسری آیت میں جو یہ "ہم" استعمال ہوا ہے تو یہ "ہم" کون ہے۔ اور نہ میرا سروکار اس ذات سے ہے جسے وین بوتھ (Wane Booth) "مقدّر مصنّف" (implied author) سے

موسوم کرتا ہے اور نہ، زیرِ نظر سورت کے سیاق و سباق میں، اس کے ہمراد "مقدّر قاری" (implied reader) سے، کیوں کہ اس میں بہت سے الوہی تبصّیں چھوٹ جانے کا احتمال ہے تاہم میں یہ مختصر سی عرض داشت ضرور کرنا چاہتا ہوں کہ اگر ہم یہ "قبول" کرتے ہیں، جیسے کہ قرآن کا منشا ہے، کہ کوئی "حقیقی" مصنّف، اللہ کے نام کا، ضرور موجود ہے تو پھر بیانیے کے متن میں ہم یعنی "حقیقی" قاری اور ہمارا مثنّیٰ یعنی "مقدّر" قاری، دونوں ایک ہی ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر، قرآن میں یوسف کا بیانیہ صرف اس وقت عمل پذیری کا سزاوار ہو سکتا ہے جب اس کا قاری مسلمان ہو، اور باایمان مسلمان ہو؛ دوسری طرف بائبل اس قسم کی کوئی توقع اپنے قارئ سے نہیں رکھتی۔

تھوڑا سا غوروفکر کیجیے تو پتا چلتا ہے کہ اس بیانیے کی نسبت سے جو ہمارا تصوّر ہے وہ پورے کا پورا غلط ہے۔ پہلے تو یہی کہ وہ دنیا جس نے اسے تخلیق کیا تھا، فعل "پڑھنا" سے جو معنی مراد لیتی تھی، وہ اس معنی سے مختلف ہیں جو ہم مراد لیتے ہیں۔ قرآنی لفظ "قرأ" کا مطلب دراصل سنانا/تلاوت کرنا ہے۔ کیا ہم واقعی یہ تصوّر بھی کر سکتے ہیں کہ ایک ایسی دنیا میں جس کا دارومدار منہ زبانی معاملت پر ہو، جب یہ بیانیہ بہ آوازِ بلند پڑھا جا رہا ہو تو اسے کو سننے کی کیا کیفیت ہوتی ہو گی؟ کیا ہم "بیانیے" کی نسبت سے اپنے مخصوص تصوّرات کو اطلاق اس چیز پر کرنے میں حق بجانب ہیں جو، مانا کہ اپنا تعارف ایک قصے کی حیثیت سے کراتی ہے، تاہم اس بات کا اطمینان بھی کر لیتی ہے کہ اس قصے کی تعریف کی جو حدود مقرر کی جائیں، وہ مختلف ہوں؟

قصّہ یوسف کی جو روایت قرآن میں آئی ہے میں اس کے صرف دو نکتوں کی وضاحت قدرے شرح و بسط کے ساتھ کروں گا۔ پہلے نکتے کا تعلق سازباز کرنے والے بھائیوں سے ہے۔ ان میں سے ایک بھائی کے انداز سے کچھ یوں ظاہر ہوتا ہے جیسے اس نے بائبل کی روایت سی رکھی ہو "اتنے میں ان ہی میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو بلکہ انہیں (ایسے) اندھیرے کنویں میں ڈال دو کہ انہیں کوئی راہ گیر (بَعضُ السیّارۃ) نکال لے جائے" (قرآن ۱۲:۱۰) اس کے ٹھیک آٹھ آیتوں بعد؛ "اور ایک قافلہ آ نکلا۔ سو ان لوگوں نے اپنا سقّہ بھیجا اور اس نے اپنا ڈول ڈالا اور بول اٹھا ارے واہ واہ، یہ تو ایک لڑکا نکل آیا!" (قرآن ۱۲:۱۹)۔ یعنی قرآن نے بائبل کی روایت "ای" کا انتخاب کیا ہے، وہی جس میں مدیانیوں کے یوسف کو تاریک گڑھے سے نکالنے کا ذکر ہے۔

تاہم جنسی ترغیب دلانے والے متظر میں قرآنی روایت بڑے نادر حظِ لطیف کی حامل ہے فوطیفار کی بیوی، یا قرآنی روایت کی زلیخا، یوسف گریزاں کا کرتا پکڑ لیتی ہے -- ظاہر ہے یوسف کی آستین کا ناپ لینے کے واسطے نہیں -- جو اس کھینچاتانی میں پھٹ جاتا ہے؛ بعد ازاں وہ ان پر اپنی بےحرمتی کی کوشش کرنے کا الزام دھرتی ہے۔ "اگر ان کا پیراہن آگے سے (مِن قُبُل) پھٹا ہو" اس کے (زلیخا کے) خاندان سے ایک گواہ نے گواہی دی، "تو وہ سچّی ہے اور یہ جھوٹے اور اگر ان کا پیراہن پیچھے سے (مِن دُبُر) پھٹا ہو تو وہ جھوٹی اور یہ سچے" (قرآن ۲۷ - ۲۶ :۱۲)۔

Scanned with CamScanner

سورتِ یوسف میں جب میری نظر اس تفصیل پر گئی تو مجھے اس میں ایک ماہر قصہ گو کی بےحد لطیف کاری گری دکھائی دی۔ بعد میں جا کر میں نے دریافت کیا کہ "مدراش" (Midrash)(۱) نے جوزف کے نئے پیرایے میں جوہری طور پر موجود دیگر بیانیہ امکانات کا اندازہ پہلے ہی کر لیا تھا۔ تاہم یہ "سیفر ہایشار" (Sefer Hayasher) (۲) میں تھا، جو نویں دسویں صدی کے قرونِ وسطیٰ کی پیداوار تھی۔ نتیجے میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن یہودی روایت کی زبانی اساس رہا ہو یا زیادہ قرینِ قیاس یہ ہے کہ خود قرآن ہی نے تفسیری اور زبانی یہودی روایات کو سمو لیا ہو۔ (ٹھیک اسی طرح "سیفر ہایشار" میں بائبل کے "برے درندے" کے بجائے، قرآنی "بھیڑیے" کا ذکر آیا ہے؛ اور زنانِ مصر کی اپنے ہاتھ زخمی کر لینے والی تفصیل بھی بعضے بعضے "مدراش" میں ملتی ہے، وغیرہ وغیرہ)۔

یہاں پہنچ کر ہمیں بائبل اور قرآن کے بےحد نمایاں اختلافات میں سے ایک کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً اول الذکر کی "خواندگی یا حرفیت" (literacy) اور ثانی الذکر کی "زبانیت یا قَولیت" (orality) ۔ نزول اور جمع قرآن کے تیرہ سو سے زائد سال بعد، آج بھی یہ دعوا کیا جا سکتا ہے کہ اس کتابِ مقدس کی حفظ کی ہوئی کوئی آیت، تحریرشدہ آیت کے مقابلے میں، نسبتاً زیادہ مستند اور معتبر سمجھی جاتی ہے۔ اس بات کو دوٹوک انداز میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن اپنے کاتبین کو بہت زیادہ قابلِ اعتبار نہیں گردانتا، اور یہ اس لیے کہ دورانِ نقل و تحریر کاتب غلطی کے مرتکب بھی ہو سکتے ہیں؛ قرآن لکھے ہوئے لفظ کو معتبر نہیں سمجھتا، بلکہ اسے جو حافظے میں محفوظ کیا جا چکا ہو۔ اسلام حافظے ہی کو قابلِ اعتماد سمجھتا ہے؛ چنانچہ قرآن کا وجود (تحریرشدہ) متن پر منحصر نہیں، بلکہ اس کے برخلاف رواۃ کے انسانی حافظے پر۔ دوسری طرف بائبل، Scriptures یعنی لکھا ہوا لفظ ہے؛ اور یہ سچ مچ اپنے وجود کے واسطے حروف کی ایجاد کی رہینِ منت ہے۔

افلاطون کے *Dialogues* میں سقراط، فیدروس (Phaedrus) کو حروفِ تہجّی کی ایجاد کی کہانی سناتا ہے؛ کس طرح مصر کے شہر نوکراتس (Naucratis) میں تحوت (Theuth)نام کا ایک مشہور قدیم خدا ہوا کرتا تھا، جو مختلف فنون کا موجد تھا اور جس کی عظیم ترین دریافت حروفِ تہجّی کا استعمال تھا۔ تو ان دنوں خدا تحاموس (یا "آمون") (Thamus)پورے مصر کا بادشاہ تھا۔ تحوت اس کے پاس آیا اور اپنی ایجادات دکھائیں۔ جب حروفِ تہجّی کی باری آئی تو تحوت نے کہا: "یہ مصریوں کو زیادہ عقلمند بنائے گا اور ان کے حافظے کو فروغ دے گا"۔ تحاموس نے جواباً کہا: "اے موجد ترین تحوت، تم جو حروفِ تہجّی کے باوا آدم ہو، محض پدرانہ شفقت کے مارے اپنی اولاد سے ایک ایسی خصوصیت منسوب کر رہے ہو جو انہیں کبھی ملنے کی نہیں۔ تمھاری یہ دریافت آموزندگان کی روح میں فراموشی کو راہ دے گی، کیوں کہ وہ اپنے حافظے کے استعمال ہی سے بےنیاز ہو جائیں گے اور خارج میں لکھے

(۱) "مدراش"، "توراۃ" کی شرح، تفسیر اور تاویل کے اس طریقے کو کہتے ہیں جو اہلِ یہود کے یہاں رائج ہے۔
(۲) ایک مدراشی کتاب جس میں تخلیقِ آدم سے ایامِ منصفین (توراۃ) تک کی تاریخِ عالم بیان ہوتی ہے۔

ہوئے حروف پر بھروسا کرنے لگیں گے۔ یہ چیز جو تم نے دریافت کی ہے، یہ حافظے (memory) کی افزائش میں مدد نہیں دینے کی بلکہ یادآوری کی افزونی میں؛ اور تم اپنے شاگردوں کو سچائی نہیں، محض اس کی مشابہت ہی عطا کرتے ہو" (فیدروس، ۲۷۵)۔

"حافظے" کی قدرت، آپ جانتے ہی ہیں، اس چیز کی سرشت میں موجود تھی جسے "قضیۂ ہومری" (The Homeric Question) سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے ستر سال پہلے ملمان پاری (Milman Parry) نے اٹھایا تھا۔ اسے اس سوال کا ایک طرح کا "نقطۂ عروج" کہنا چاہیے جو ہومر کی بعضے بعضے قارئین کے اذہان پر آسیب کی طرح سوار تھا۔ پاری نے استدلال کیا کہ ہومری شاعری کی تقریباً ہر ممتاز خصوصیت اس کفایتِ لفظی کی رہینِ منت ہے جو سخن گوئی کے تقریری (oral) ذرائع اس پر عائد کرتے ہیں۔ یہ عروضی (متعلّق بہ اوزانِ شعر) ضروریات ہی ہیں جو، بہ ایں طور و بہ آں طور، ہر ایسے شاعر سے جو پابند (موزوں) شعر کہنے کا جویا ہو، الفاظ کا انتخاب کرواتی ہیں۔ "ایلیاد" (Iliad) اور "اوڈیسی" (Odyssey) میں استعمال ہونے والے الفاظ کا بےحد حقیر حصہ ہی ایسا تھا جو مروّجہ تراکیب (formulas)اور پیشِ پا افتادہ فقروں (cliches) کا جزو نہ ہو۔ صدیوں پہلے مشکّل اور بارِدگر مشکّل ہونے کے عمل سے گذرنے کے بعد ہی کہیں جا کر دونوں رزمیہ داستانیں، "ایلیاد" اور "اوڈیسی"، ۷۰۰ سے ۶۵۰ قبلِ مسیح میں کسی وقت نئے یونانی رسم الخط میں ضابطۂ تحریر میں لائی گئیں اور یہ اس رسم الخط میں لکھی جانے والی پہلی طویل نظمیں تھیں۔

۱۹۶۳ میں ایرک ہیولاک (Eric Havelock) اپنی تصنیف *A Preface to Plato* میں پاری سے استفادہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ایک ایسے کلچر میں جس کا دارومدار خالصتاً زبانی روایت پر رہا ہو، علم اپنے حاصل ہو جانے کے بعد مسلسل تکرار کا حاجت مند رہتا تھا، ورنہ محو ہو جاتا تھا۔ چنانچہ مقرّرہ اور سکّہ بند فکری نمونے دانش مندی اور موثر تعلّم و نسق کے لیے ازبس ضروری ہوتے تھے۔

یہ بات ذہن نشین رکھیے کہ افلاطون کے دور میں (۴۲۷ تا ۳۴۷ قبلِ مسیح)، اہلِ یونان "تحریر" کو بڑے کارگر داخلی طور پر اپنا چکے تھے۔ علم کی ذخیرہ اندوزی کا نیا طریقہ اب مقوّیِ حافظہ تراکیب سے ہٹ کر باضابطہ تحریری متن میں آ رہا تھا۔ یونانیوں کی دانست میں اس سے ذہنِ انسانی کو نسبتاً زیادہ مولِک (original) اور مقابلتاً زیادہ تجریدی (abstract) خیال کی بافت کی آزادی مل گئی۔ ہیولاک نے ثابت کر دکھایا ہے کہ افلاطون نے شعرا کو اپنی مثالی جمہوریت سے بدر کر دیا تھا تو محض اس لیے کہ وہ خود ایسی فکری (noetic) کائنات میں پہنچ چکا تھا، جہاں جملہ مروّجہ تراکیب اور گھسے پٹے فقرے، جو تمام روایتی شاعروں کو مرغوب ہوا کرتے ہیں، بےوضع اور بےثمر ہو چکے تھے۔ جہاں تک خود افلاطون کا تعلق ہے، تو اس بات نے اس کا لاشعور ہی تہ و بالا کر ڈالا؛ فیدروس میں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ لکھنے لکھانے کے سخت خلاف ہے۔ چنانچہ یہ علمی تاریخ میں ایک ایسا لمحہ ہے جب داخلی طور پر اپنائی ہوئی خواندگی نہایت بےجگری کے ساتھ زبانیت یا تقریر سے متصادم ہوتی ہے۔

نہیں کہ تحریر اور تقریر کے ہیجانگراں تصادم کا یہ لمحہ عربی ادب کی تاریخ میں کبھی آیا ہو۔ رہا عبرانی ادب، تو میرا خیال ہے کہ یہ وہاں ضرور آ چکا ہے، مینار یا برج بابل (Tower of Babel) کے قصّے میں، جس کی طرف میں جلد ہی متوجہ ہونے والا ہوں۔

مائیکل زویٹلر (Micheal Zwettler) نے اپنی متنازعہ فیہ تصنیف "قدیم عربی شاعری کی زبانی روایت" *(The Oral Tradition of Classical Arabic Poetry)* میں پاری اور لارڈ کے پیش کردہ فارمولائی یا سکّہ بند طرز کے نظریے کو قدیم عربی شاعری پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے جو، میرے خیال میں، ایک نہایت ہی ذکی کاوش ہے۔ زویٹلر رقم طراز ہے: "یہی وہی تعلیمی نظام جنھوں نے ماقبلِ جدید (pre-modern) معاشروں کے کم از کم بعض حلقوں میں شرح خواندگی میں نسبتاً زیادہ اضافہ کیا اور ان میں لکھے ہوئے لفظ کی پرورش کی -- جیسے قدیم ہندوستان، عرب اسلامی تمدن -- انھیں تعلیمی نظاموں نے کسبِ علم اور استحضارِ علم کے واسطے جن ذرائع پر خاص طور پر اعتماد کیا وہ ازبر کرنا اور قرأت کرنا تھے؛ اور اس طور پر مطالعہ کی ہوئی، سیکھی ہوئی اور زبانی دہرائی ہوئی چیزوں میں نمایاں ترین شعری متون ہیں۔ تاہم مجھے یہ یقین نہیں کہ زویٹلر کا اشارہ اس بےحد نمایاں مماثلت کی طرف بھی ہے یا نہیں جو افلاطون اور محمدؐ کی شاعروں سے ناخوشی کے مابین پائی جاتی ہے۔ محمدؐ کی ناخوشی قرآن کی متعدد سورتوں سے صاف ظاہر ہے، خاص طور پر "سورت الشعرا" کی ان آیتوں سے: "وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ۔ أَلَمْ تَرَ أَنَّهُمْ فِي كُلِّ وَادٍ يَهِيمُونَ۔ وَأَنَّهُمْ يَقُولُونَ مَا لَا يَفْعَلُونَ"۔ یعنی: "اور رہے شاعر تو ان کی پیروی بدراہ لوگ کرتے ہیں۔ کیا تجھے خبر نہیں کہ وہ (شاعر) ہر میدان میں حیران پھرا کرتے ہیں اور وہ کہتے وہ ہیں جو وہ کرتے نہیں" (قرآن ۲۶:۲۲۴-۲۲۶)۔

اسلام میں، خاص طور پر، علم اللسان اور علوم نقلی کی خدمت کے واسطے حفظ کرنے کو اور زبانی روایت کو پوری قرونِ وسطیٰ کے دوران -- خواہ واقعی طور پر، خواہ محض ایک افسانے کی حیثیت سے -- تقدّم حاصل رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ لکھنے لکھانے کی ایک بڑی شاداب اور مثمر روایت بھی چلتی رہی ہے۔ زویٹلر اس طرف توجہ کراتا ہے کہ "کتاب اور لکھے ہوئے لفظ کا الجاحظ جیسا متشدّد حمایتی بھی سیکھنے کے عمل میں زبانی روایت کے تقدّم اور حافظے کی ضرورت کے اثبات کا بےجھجھک قائل ہے"۔

میں یہاں ایک مخصوص شاعرانہ تصرّف (poetic license) سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اشتہاری وقفے (commercial break) کا اعلان کرتا ہوں تاکہ ہم اپنے آغاز والے موضوع کی طرف مراجعت کر سکیں؛ یعنی قمیص اور آستین کا ناپ۔

ہاں تو صاحب، اس عجوبے سے، یعنی قمیصوں اور ان کی آستینوں کے ناپ سے، میرا سامنا اس وقت ہوا جب میں پہلی بار ایبی آرمر (مشی گن) کے ایک ڈپارٹمنٹ اسٹور میں داخل ہوا؛ اور اس توجہ کو دیکھ کر اتنا ہی محظوظ ہوا جو یہاں ڈپارٹمنٹ اسٹورز والے برقی سیڑھیوں

(escalators) کو دیتے ہیں۔ برقی زینے کی سواری کا لطف میں نے ایک نوعمر لڑکے کی حیثیت سے حیفہ کے شہر میں زمیں دوز ریل گاڑی کے اسٹیشن میں اٹھایا تھا۔ یہ کم و بیش تیس سال پہلے کی بات ہے۔ تاہم پچھلے بیس سال سے یروشلم کا باشندہ ہونے کے باوجود میں اس سواری سے دوبارہ لطف اندوز نہیں ہوا ہوں۔ ڈپارٹمنٹ اسٹورز میں جانے کا اتفاق ہوا بھی تو وہاں میں نے ہمیشہ ہی ایلی ویٹر (elevators) کو ایسکیلیٹر پر ترجیح دی۔

تاہم ایلی ویٹرز، جیسا کہ مجھے آگے چل کر معلوم ہونے والا تھا، قصہ گو نہیں پیدا کرتے۔

پچھلی گرمیوں میں میری نظر رسالہ "ہارپر" *Harper* کی مئی کی اشاعت میں ایک بڑے ہی پرلطف اور ذکاوت سے مہکتے ہوئے مضمون پر پڑی جو ایلی ویٹرز اور ایسکیلیٹرز کے بارے میں تھا۔ اس ادبی پارے کے مصنف جیری ہیرون (Jerry Herron) تھے (جو ڈیٹرائٹ، مشی گن، کی وین ہوتھ ہونی ورسٹی میں انگریزی کے استاد ہیں)۔

> ٹھیک سیڑھیوں کی طرح، جن کی یہ نقالی کرتا ہے (ہیرون لکھتا ہے)، ایسکیلیٹر کا مقصد بیانیہ (narrative) اور ناصحانہ (didactic) ہے۔ یہ سوار کو وقت کے بیچ سے حرکت کراتا ہوا لے جاتا ہے، اور جوں جوں یہ حرکت آگے بڑھتی جاتی ہے، ہر منزل (story) کا مقصد، اپنی اشیائے فروختنی سمیت، بڑے فطری طریقے پر ظاہر ہونے لگتا ہے، بالکل ایک ناول میں پلاٹ کے بتدریج ارتقا کی طرح -- یہ مہارت ایلی ویٹر کے سوار کا مقسوم بھلا کہاں۔ اس بیچارے کو کبھی معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ کہاں ہے اور، نتیجتاً، وہ اکثر و بیشتر سرگرداں ہی رہتا ہے: "ہم کہاں ہیں؟ کیا اسی منزل کا قصد تھا؟"

میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو خیال آیا کہ برجِ بابل کے قصّے کا اس سے زیادہ مناسب اور بھرپور [illegible] کوئی اور کیا ہو سکتا ہے۔ "اگر بابل کے برج کی تعمیر، اس پر چڑھے بغیر ممکن ہوتی،" جیسا کہ کافکا بجا طور پر مدّعی ہے، "تو شاید اس کام کی اجازت مل جاتی۔" یعنی، اگر مینار پر ایلی ویٹر کے ذریعے چڑھا جا سکتا، تو کام کی اجازت مل جاتی۔ یہ الفاظ دیگر، اگر بیانیے کی سیڑھیاں نہ چڑھنی پڑتیں تو کام کی اجازت مل جاتی۔ ایسا لگتا ہے کہ خدا نے کہا ہو گا، اچھا اچھا، اوپر آ جاؤ، لیکن کسی سے اس کا "ذکر" نہ کرنا؛ کسی سے اپنے اوپر چڑھنے کے قصّے" کا "ذکر" مت کرنا۔ بہرحال، اہلِ بابل نہ صرف یہ کہ "نام کمانے" کے خواہش مند تھے، بلکہ خاص طور پر پوری واردات کی قصہ خوانی کے بھی۔ اور بس اسی بات کا خدائے شبہ گرد (the Confounder) کو سب سے زیادہ خوف تھا۔

بابل کا بیانیہ، "کتابِ آفرینش" کے گیارھویں باب میں نقل ہونے کے باوجود، حقیقت میں بائبل کا وہ آخری باب ہے جس کا پس منظر قدیم مشرقِ قریب کی دیومالا ہے۔ یہ اس دائرے کی تکمیل کرتا ہے جو آفرینش سے شروع ہوا تھا، اور سیلابِ نوح سے ہوتا ہوا آگے بڑھا تھا۔ اسے، ایک طرح سے، ماقبلِ بائبل کی محو ہوتی ہوئی اس دنیا پر راہزنی کا آخری موقع کہنا چاہیے؛ لو بھئی، تمھارا یہاں انجام ہوتا ہے، اور ہمارا آغاز۔ بیانیے کا مقصد، منجملہ دیگر باتوں کے، شبہ

Scanned with CamScanner

کامیاب ہو جائے، لیکن بُرج پر چڑھنے کے لیے، بُرج تعمیر کرنا شرط نہیں۔ آدمی بُرج پر بیانیے اور قصّے کہانیوں کے ذریعے بھی چڑھ سکتا ہے۔ اِن معنی میں، اس بیانیے کے بعد بائبل میں آنے والے تمام بیانیے ہی بابِل کا حقیقی بُرج ہیں۔

ٹھیک اِسی لیے اگر بُرجِ بابِل میں ایلی ویٹر نصب کر دیا جائے تو اِس سے کوئی مدد نہیں ملنے کی۔ صعود سے بُرج کی تعمیر کرنے والوں کا جو مقصد تھا، وہ دراصل سیڑھیوں ہی میں مجسّم تھا۔ اوپر جانے کا فائدہ ہی کیا اگر آدمی خود کو اوپر جاتا ہوا دیکھ نہ سکے؟ جس چیز سے واقعی معنوں میں فرق پڑتا ہے وہ "نقطۂ نظر" (point of view) کا ہونا ہے۔

قصّۂ بابِل سے متعلق جو خوشنما ترین روایتیں "مدراش" میں آئی ہیں، اِن میں سے ایک کے مطابق "بُرجِ بابِل کا خرابہ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اِس میں کد یہ ہے کہ جو کوئی بھی اسے دیکھے گا، اُس پر حافظہ کھو دینے کا سراپ آ پڑے گا۔ روئے زمین کے وہ تمام لوگ جو یہ کہتے پھرتے ہیں، میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟، وہی ہیں جو بُرجِ بابِل کا خرابہ دیکھ چکے ہیں" ("مدراش رباہ")۔ (۳)۔ القصّہ، بابِل کا بُرج، حافظے کے سقوط اور تخیّل کے آغاز کا غمّاز ہے، زمانیت کے ختم اور (حروفِ تہجّی کی ایجاد کے ساتھ) خواندگی کے آغاز کا۔ اور ہمیں، فی الواقع، عربی ادب کے کبھی ہاتھ نہیں آ سکا، اُس کا اپنا خاص الخاص بُرجِ بابِل؟

عربی ادب کی ایک مشہور حکایت ہے (جو، برسبیلِ تذکرہ، لبنانی ناول نگار الیاس خوری -- جن کا ناول *Little Mountain* پچھلے سال یہاں سے چھپ چکا ہے -- اکثر بیان کرتے ہیں)، جس کے مطابق ابونُواس (وفات ۸۱۳ء دورِ عبّاسی کے عظیم عربی شعرا میں سے ایک، اُن نادرِ روزگار شعرا میں سے جو بظاہر شہر بصرہ میں اپنی مدہوشی سے لطف اندوز ہوتے تھے، تاہم شراب نوشی کے موضوع پر نہایت باہوش شعر کہنے کی قدرت بھی رکھتے تھے) خلف الاحمر سے، جو پورے بصرے میں سب سے زیادہ سخن شناس اور سخت گیر نقّاد کی حیثیت سے مشہور تھا، شعر کہنے کی اجازت لینے جاتا ہے۔ موخر الذکر یہ شرط لگاتا ہے کہ پہلے ایک ہزار عربی نظمیں (قصائد) حفظ کر کے دکھاؤ، پھر اجازت ملے گی۔ ابونُواس جا کر بادیتُ العرب کی اعراب کے درمیاں بود و باش اختیار کرتا ہے -- جن کے یہاں، عربی زبان اور لہجہ، والٹر بن یامین کے مفہوم میں، اپنی خالص ترین شکل میں محفوظ تھا -- اور، حسبِ ہدایت ایک ہزار عربی نظمیں ازبر کر کے لوٹتا ہے۔ خلف الاحمر چند نظمیں سنانے کی فرمائش کرتا ہے، اور ابونُواس اُس کے حکم کی تعمیل۔ پھر پوچھتا ہے، "اب مجھے شعر گوئی کی اجازت ہے؟" خلف الاحمر کہتا ہے، "بصد شوق، لیکن اِس سے پہلے یہ جو تم نے ایک ہزار نظمیں حفظ کی ہیں، انھیں بھول کر دکھانا ہو گا۔"

(یہ حکایت، ابونُواس سے متعلق حکایات کی اُس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے جسے ابن

(۳) "رباہ" آرامی زبان میں "بڑے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ "مدراش رباہ" سے مراد "مدراشِ عظیم" ہے جس میں "تورات" کی دس کتابوں کی تفسیر پیش کی گئی ہے۔

لیکن میری مراد اس قسم کے حافظے سے نہیں۔

والٹر بن یامین (Walter Benjamin) اپنے مضمون "قصّہ گو" (The Storyteller) میں، جو ۱۹۳۶ میں Reflections on the works of Nikolai Leskov کے ذیلی عنوان کے ساتھ شائع ہوا، اس بات پر اپنے غم اور مایوسی کا اظہار کرتا ہے کہ "قصّہ گوئی کا فن اب ختم ہوتا جا رہا ہے؛ اب ہماری مُڈبھیڑ ایسے لوگوں سے کم ہی ہوتی ہے جن میں سلیقے سے قصّہ گوئی کی صلاحیت پائی جاتی ہو۔" اِس کا سبب، جیسا کہ بن یامین نے کہا ہے، یہ ہے کہ اب تجربے کی قدر و قیمت گھٹ گئی ہے (یاد رہے کہ یہ ذکر ۱۹۳۶ کا ہے) اور تجربات کو سننے سنانے کی ہماری صلاحیت زائل ہوتی جا رہی ہے۔ ناول کے ارتقا اور چھاپے خانے کی ایجاد نے قصّہ گوئی کے زوال کی ابتدا کی، کیونکہ جو بات ناول کو کہانی (story) سے، یا بلکہ زیادہ صحیح طور پر قصّے (tale) سے، ممیّز کرتی ہے، وہ اُس کا کتاب پر ناگزیر دارومدار ہے۔ جہاں فردِ تنہا ناول کی جائے پیدائش ہوتا ہے اور جہاں ناول نگار خود کو جمعیّت سے علیحدہ کر لیتا ہے، وہاں قصّہ گو اپنے سُننے والوں کا دست نگر ہوتا ہے اور اُن کو دینے کے لیے، بن یامین کے قول کے مطابق، ایک "صلاح مشورہ" (counsel) بھی رکھتا ہے، جو کوئی کارآمد شے ہوتی ہے، جیسے اخلاقی درس، عملی نصیحت، یا حکیمانہ قول۔ دوسری طرف، ناول نگار، جو خود صلاح مشورے سے محروم رہا ہے، کسی اور کو کیا صلاح مشورہ دے سکتا ہے۔ اُس سے جو "دانش" منسوب کی جاتی ہے، اُس کا ماخذ پہلے سے تیّار شدہ معلومات ہوتی ہیں، اور یہ دانش قصّہ گو کی "ذہانت" کے برخلاف ہوتی ہے، جو کہیں بہت دور سے، یاد کے سہارے سہارے چلی آ رہی ہے۔ الغرض، بن یامین کے عندیے کی اگر بڑی مبتذل سی تشریح کریں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ تان حافظے اور تخیّل پر آ کر ٹوٹتی ہے، جو، علی الترتیب قصّہ گو اور ناول نگار کے اوزار ہیں۔

حافظہ، بن یامین کے مطابق، "روایت کے اُس سلسلے کو خلق کرتا ہے جو واردات یا واقعے کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچاتا ہے -- یہ اُس بافت کی ابتدا کرتا ہے جسے، انتہائے کار، گوناگوں کہانیاں مل جُل کر تکمیل کو پہنچاتی ہیں۔ ایک کڑی دوسری کڑی سے جا ملتی ہے، جیسا کہ تمام عظیم قصّہ گو، خاص طور پر مشرقی قصّہ گو، ہمیشہ سے بہ سہولتِ بسیار دکھاتے چلے آئے ہیں۔" جس پر میں (خالص خودبینی اور خود نمائی کے جذبے کے باعث) اضافتاً یہ کہوں گا: جیساکہ عظیم مشرقی فنکار، ہمیشہ سے عربیسک (arabesque) کے نقش و نگار کی الٹ پھیر، باہم پیچیدگی اور آمیزش (interchanging, interlacing, interweaving) میں بہ آسانی دکھاتے چلے آئے ہیں، (۴) اور جس طرح عظیم قصّہ گو "الف، لیلہ ولیلہ" کے لامتناہی "عربیسکس" میں دکھاتے چلے آئے ہیں۔ یہی وجہ ہے جو بن یامین آگے چل کر کافکا پر اپنے مضمون میں شہرزاد کا ذکر لے بیٹھتا ہے، جو شاید سب سے عظیم اور پُرگو قصّہ گو تھی۔ "اُن کہانیوں میں، جو کافکا ہمارے لیے چھوڑ گیا ہے" بن یامین کے خیال میں، "بیانیے کا فن

(۴) اشارہ، غالباً، اپنے ناول "عربیسکس" کی طرف ہے۔

Scanned with CamScanner

ہم نے ایک سلسلہ شروع کیا جس کو اب تک دو سال ہو چکے ہیں جس میں ہم نے مختلف کتب کو سافٹ میں منتقل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کی قابل تعریف ویب سائٹ سے بھی کتب کو پی ڈی ایک میں منتقل کیا، ہماری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ دوستوں کے لئے نایاب و اہم کتابوں کو سافٹ میں پیش کیا جائے۔

معروف ادبی جریدے "آج" کو سافٹ میں منتقل کرنا بھی اسی کوشش کا حصہ ہے اور ادبی ذوق رکھنے والے دوستوں کے لئے ایک تحفہ

محمد ثاقب ریاض / ایڈمن برقی کتب

آپ ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہیں تا کہ مزید اس طرح کی شاندار کتب تک آپ کی رسائی ہو سکے
ہمارا وٹس اپ گروپ جس کے منتظمین کے نمبر زذیل میں ہیں

گروپ میں شمولیت کے لئے:

محمد ذوالقرنین حیدر: +92-3123050300

محمد ثاقب ریاض: +92-3447227224

Scanned with CamScanner

مستقبل۔"

"ناول کی جائے پیدائش" بن یامین کے یہ قول، "فردِ تنہا ہے۔" جدید عربی ادیب کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ اگر معاشرہ اُس کا دم نہ بھی گھونٹے دے رہا ہو اور اس کی آواز نہ بھی دبائے دے رہا ہو، تب بھی اسے ہمہ وقت گھیرے ضرور رہتا ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو اُس سے ہمہ وقت مکمّل وفاداری اور اپنے قائم کردہ آدابِ شائستگی کی بجاآوری کا مطالبہ کرتا ہے۔ تاہم ایسامعاشرہ پوشیدہ اور خوابیدہ (latent) قصّہ گویاں کی پیدائش کے لیے نہایت سازگار ہوتا ہے۔ جب تک آپ کی قصّہ گوئی چلتی رہتی ہے، سننے والوں کا کبھی کال نہیں پڑتا۔ خود شہرزاد بھی بادشاہ کی اتنی ہی ضرورت مند ہے جتنا بادشاہ اُس کا ہے۔ پوری ایک ہزار ایک راتوں سے جانبر ہونے کے لیے دو کی ضرورت ہوتی ہے -- قصّہ گو اور، کم از کم ایک سامع -- بہ شرطے کہ قصّہ، جیسا کہ بن یامین نے کہا ہے، "مستقبل کو ملتوی کر سکے"؛ بہ شرطے کہ سُننے والے کی روح میں کرم کا کچھ نہ کچھ مادّہ ضرور ہو، وہ "سُننے" پر راضی ہو، جو مشرقِ قریب کے بیشتر ممالک میں، جہاں تک حکمرانوں کا تعلّق ہے، بہرحال، ممکن نہیں۔ مشرقِ قریب کی بیشتر ریاستیں، جیسا کہ شاید آپ کو معلوم ہو، بنوز اپنی ماقبلِ شہرزاد حالت میں ہیں۔ آپ چاہیں تو سلمان رُشدی سے پوچھ لیں۔

جدید عربی ناول نگار، زبانیت (orality) کی ایک طویل اور جلیل القدر روایت سے بٹ کر لکھتے ہوے، ایک "خواندہ" (literate) قصّہ گو ہے۔ اور ساری مصیبت بھی۔ دراصل، یہی ہے، اُس کے آزار کی جڑ؛ یہ تناقضِ اصطلاحات -- خواندہ قصّہ گو۔ وہ صرف ایسی خلوت کی جستجو کر سکتا ہے جو بےوطنی کی دین ہو۔ بصورتِ دیگر اُسے یہ خود حوالہ جاتی تناقض یا قولِ محال (self-referential paradox) قبول کرنا ہو گا: ایک خواندہ قصّہ گو۔ ایسا قصّہ گو جو اپنی کہانیاں سُناتا نہیں، بلکہ انھیں لکھتا ہو؛ ایسا قصّہ گو جس نے تخیّل کے حق میں حافظے کو تج دیا ہو۔ ابونواس کے معاصرین، یعنی نویں یا دسویں صدی کے بغداد کے "ادب" (۵) کی روایت کے عرب لکھنے والوں سے مقابلہ کیجیے تو یہ اُس کے بالکل اُلٹ ذہنی صورتِ حال نظر آئے گی۔ "ادب" کی روایت میں لکھنے والا، مثلاً الجاحظ، اپنے حافظے کا اسیر تھا؛ اُن دنوں "ادب" کے دائرے میں آنے والی کسی تحریر کو لکھنے کا مطلب تھا کہ آدمی صفحۂ قرطاس پر وہ سب رقم کرتا چلا جائے جو اُس کے حافظے نے ذخیرہ کر رکھا ہے -- حکایتیں، نظمیں، وغیرہ، وغیرہ۔ "رسائلِ الجاحظ" میں کبھی کبھار تخیّل کی رمق بھی دکھائی دے جاتی ہے، لیکن بس ایک رمق ہی۔ الجاحظ کے لیے اگر کسی چیز کی واقعی اہمیت تھی تو بس وہ، انتہائے کار، یہی حافظہ تھا۔

الجاحظ کی پیدائش، "کتاب کلیلہ و دمنہ" کے مصنّف/مترجم ابن المُقفّع کے پینتیس سال کی

(۵) "ادب" یہاں محدود اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوا ہے، اور اس سے مراد دورِ عبّاسی کے اوائل میں لکھی جانے والی وہ تحریریں ہیں جن کا مابہ الامتیاز انشائی عربی نثر تھی۔ اس قسم کی فنّی یا انشائی نثر لکھنے کا آغاز فارسی کے حکایتی بیانیوں کے عربی تراجم سے ہوا۔

میں بصرے میں پیدا ہوے تھے، نسلی اعتبار سے دونوں ہی غیرعرب تھے؛ ابن المُقفّع ایرانی نژاد مَع تھا، اور الجاحظ افریقی الاصل۔ دونوں ہی پر دیلوز (Deleuze) اور گواتّری (Guattari) کی مستعمل "ادبِ صغیر" (minor literature) کی اصطلاح کا اطلاق بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ "ایک صغیر ادب ایک بےمایہ زبان کا زائیدہ نہیں ہوتا، بلکہ اُس اقلیت کا جو وہ کسی اکثریت کی زبان کے اندر رہتے ہوے خلق کرتی ہے۔" بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۷۵۹ میں ابن المُقفّع کی گردن مارنے کی اصل وجہ یہی تھی کہ وہ عربی زبان کو، دیلوز اور گواتّری کی اصطلاح میں "بے اقلیم" ("deterritorialize") کرنے کا کوشاں تھا۔ اور بالکل یہی خود استاد کبیر الجاحظ نے بھی کیا۔ اس سیاق و سباق میں، ۷۵۹ میں بصرے میں ابن المُقفّع کا قتل، تلخ خندہ انداز میں، ادبِ عربی میں خود بیانیے کے قتل کا علم بن جاتا ہے۔ ابن المُقفّع -- جس نے، کم از کم میری حد تک، "کلیلہ و دمنہ" میں شائستہ اور پسندیدہ ترین عربی اُسلوب کا استعمال کیا ہے -- اُس نادر امکان کے ضیاع کی نمائندگی بھی کرتا ہے جب عربی زبان اگر چاہتی تو بیانیے کی طرف متوجّہ ہو سکتی تھی۔ "کتاب کلیلہ و دمنہ" میں بیان کردہ جانوروں کی حکایتیں وہ نادر سیوّں ہیں جس میں ہم ادبِ عربی کی زبانیت سے خواندگی کی طرف گریز کے مضمر احتمالات کو پہچان سکتے ہیں، اور ترجمہ ہونے کے باوجود، اُس ادب میں بیانیہ بیٹوں کی کمیاب جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

(بدیع الزماں) الہَمَذانی کی کتاب "المَقامات" بافت میں تخیّل کو ایک آلے کے طور پر استعمال کرنے والی "پہلی" عربی بیئت ہے۔ تاہم، محض سو سال بعد ہی، الحَریری، اور اُس کے اندلسی یہودی ہم مشرب الحَریزی، صنفِ "مقامات" کو زبانی آتش بازی کے طوفانِ بدتمیزی میں دفن کر کے رکھ دیتے ہیں۔ عربی "اُسلوب" پھر سے غالب آتا ہے، اور بیانیے کا سلسلہ خواندہ روایت میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ "الف لیلہ" کی زبانی روایت ہی ہے جو بیانیے کے سلسلے کو زندہ رکھتی ہے۔

"الف لیلہ" کے قصّہ گو، ٹھیک کافکا کے مشہور ادبی پارے "دیوارِ چین" کے معماروں اور راج مزدوروں کی طرح، ایک دوسرے سے باخبر نہیں تھے، یہ نہیں محسوس کرتے تھے کہ کہیں نہ کہیں قصّوں کا ایک تخیّلی شہنشاہ بھی موجود تھا، جس نے اپنے تخیّل کی تنہائی میں اِس دیوارِ چین کا -- یا، جس طرح بورخیس نے لکھا ہے، اِس گوتھک کلیسا کا -- تصوّر کیا تھا۔ جدید عربی ادیبوں کو، جنھیں اُنھیں معماروں کا خلف کہنا چاہیے، کم و بیش پانچ سو سال بعد اپنی تنہائی کو باقاعدہ ایجاد کرنا پڑا -- یعنی اگر ہم بن یامین سے اتّفاق کریں تو -- تاکہ لکھ سکیں۔

دوسری طرف، عرب ادیبوں کو پتا چلا کہ اب نہ اُن کا حافظہ رہا ہے اور نہ، اِسی لیے، اپنے قارئین کو دینے کے واسطے اُن کے پاس، بن یامین کے الفاظ میں "کوئی صلاح مشورہ۔" چنانچہ وہ قصّہ گوئی کی طرف لوٹنے سے بھی معذور ہیں۔ ۱۴۹۲ میں سقوطِ غرناطہ اور اندلس سے اِخراج، عرب شعور میں، منجملہ دیگر باتوں کے، حافظے کے ختم اور "صلاح مشورے" کے زوال کا علم بھی ہے۔ گویا عرب قصّہ گو روپوش ہو گیا، چار سو سال کے لیے، اوائل انّیسویں صدی تک۔ وہ بنوز اپنی روپوشی کے دور میں تھا جب سترھویں صدی کے طلوع پر سروانتیس نے اپنا "ڈان

Scanned with CamScanner

(polyphonic) فن سے استفادہ کیا -- قصّہ گوئی کا ایسا پولیفنک اسلوب جس میں، ٹھیک بیروک (Baroque) طرز کے پیانو موسیقی کے کسی پارے کی طرح، بایاں ہاتھ عام طور پر ایسا مُوافق اور ترتیب بخش نغمہ مہیا کرتا ہے جو ہارمونی بُنت کو پُر کر دیتا ہے -- ایک بنیادی کہانی -- اور دائیں ہاتھ کو ایک ثانوی قصّے کی نغمگی کو ادا کرنے، پھر مدّھم/نچلے سُر کی طرف پلٹنے، اور فوراً بعد ہی اُس سے گریز کرتے ہوئے آگے بڑھ جانے دیتا ہے۔ (٦)۔ اُنیسویں صدی کی عربی بعثتِ جدید (النّہضہ؛ Renaissance) میں جب عربی نثر بارِ دگر ایجاد کی گئی، تو عرب ادیبوں نے (جیسا کہ الیاس خوری نے، جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں، اِس طرف بالکل درست اشارہ کیا ہے) جس زبان کا احیا کیا وہ شعرا کی مُمِد حافظ تقریری زبان تھی، نہ کہ عظیم عرب فلسفیوں کی تفکّراتی، مقابلتاً زیادہ تجرید پسند، تاہم نسبتاً زیادہ ٹھوس اور خواندہ زبان۔ یہ وہی فلسفی تھے جن کے دماغ قرونِ وسطیٰ کی تمام مدّت کے دوران یونانی فلسفے کے عربی تراجم تیار کرنے کے مسئلے سے گتھے ہوئے تھے۔

اِس کے برخلاف، جدید عبرانی ادیب کو عبرانی زبانیت سے نبرد آزما ہونے کی کوئی حاجت نہیں۔ اُس کی زبان ایک لکھی جانے والی زبان ہے، لکھا جانے والا رسم الخط ہے (٧)۔ یہی وجہ ہے کہ گذشتہ صدی میں عبرانی نثر کی ایجاد تو ایک عظیم معجزہ تھی۔ بلکہ اب بھی ہے۔ غور کیجیے تو یہ معجزہ بھلا کہاں تھا؛ عبرانی ادیب خود زبان کی "تنہائی/ خلوت" سے بہرہ اندوز ہو سکتا تھا، یعنی ایک ایسی چیز سے جو پچھلے دو ہزار سال کی بےوطنی کے دوران بڑے جوکھم سے حاصل کی گئی تھی۔ یہ بےوطنی، مادرِ تنہائی، وہ تجربہ ہے جس سے عربی زبان بحیثیت ڈسکورس کی زبان کی حیثیت سے نہیں گزری۔ تو کیا اس سے اس بات کی وضاحت نہیں ہو جاتی کہ ایک اوسط درجے کا جدید عبرانی ناول ایک اوسط درجے کے جدید عربی ناول سے کیوں بدرجہا بہتر ہوتا ہے؟

اور طرفہ یہ کہ جدید عبرانی ناولوں میں کا بہترین ناول "زخروں دواریم" Zikhron Dvarim (جو Past Continuous کے عنوان سے ١٩٨٥ میں امریکا سے Schocken Books نے شائع کیا ہے) جس کے مصنّف یاکوف شبتائی (Ya'kov Shabtai) ہیں، قصّہ گوئی کے فن پر ایک ویری ایشی ، بلکہ اُس کو ایک عظیم الشان خراجِ عقیدت ہے۔ اس بات کی چغلی تو خود ناول کا عنوان کھا رہا ہے؛ "زخروں دواریم"، جس کا مطلب، حرف بہ

(٦) اس جملے کے ترجمے کی شوریدہ سری اور لڑکھڑاہٹ بالکل ظاہر ہے۔ انگریزی اصل دیکھیے :

"...... utilizing the polyphonic art of storytelling of the *Thousand And One Nights*; a polyphonic style of storytelling in which, as in a Baroque piano piece, the left hand usually provides a framing accompaniment that fills out the harmonic texture, a basic story, and lets the right hand carry out the melody of a subsidiary tale and then return to the bass and leave it again with another melody."

(٧) اِسی واسطے یہودیوں کو اہلِ کتاب کہا جاتا ہے۔

حرف، مذکرہ، یا یاد دلانے والی چیز (memorandum) نکلتا ہے۔

آخراً، اِس دفترِ منتشر کو سمیٹنے کے واسطے، مجھے مندرجہ ذیل کہانی کی بازخوانی کی اجازت دیجیے، جو والٹر بی یامین نے کافکا پر اپنے بڑے ہی دل موہ لینے والے مضمون میں حکایت کی ہے؛

ایک حسیدی (٨) گاؤں میں، یوم السّبت کی ایک شام کچھ یہودی ایک دقیانوسی سی سرائے میں بیٹھے تھے۔ یہ سب کے سب مقامی باشندے تھے، بجز ایک شخص کے جس سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ یہ ایک مفلس اور خستہ حال آدمی تھا جو کمرے کے پچھلے حصّے میں ایک تاریک سے کونے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ حاضرین نے دنیا جہان کی باتیں کیں۔ پھر یہ تجویز ہوا کہ ہر شخص بتائے کہ اگر اُس کی خواہش پوری ہو سکے تو وہ کس چیز کی خواہش کرے گا۔ ایک آدمی نے روپے پیسے کی خواہش کی؛ دوسرے نے داماد کی؛ ایک تیسرے نے بڑھئی کے کام کرنے کی میز کی؛ اور یوں ہر شخص نے، باری باری، اپنی تمنّا کا اظہار کیا۔ جب سب ختم کر چکے تو بس کونے میں بیٹھا ہواوہ حقیر فقیر سا اجنبی ہی بچ رہا تھا۔ اُس نے بعد تامّل اور بادلِ ناخواستہ سوال کا جواب یوں دیا؛ "میری خواہش ہے کہ میں ایک زبردست بادشاہ ہوتا، جو ایک بہت بڑے ملک پر حکمرانی کر رہا ہوتا۔ پھر ایک رات، جب میں اپنے محل میں محوِ خواب ہوتا، ایک دشمن میرے ملک پر حملہ آور ہوتا۔ صبح ہونے تک اُس کے گھڑ سوار محل میں در آئے ہوتے، اور اُنھیں کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا ہوتا۔ میں جب نیند سے بیدار ہوتا تو میرے پاس اِتنی مہلت بھی نہ ہوتی کہ کپڑے ہی پہن لوں، اور مجھے محض اپنے کرتے ہی میں فرار ہونا پڑتا۔ پہاڑوں، وادیوں اور جنگلوں سے دن رات ہوتا ہوا میں، انتہائے کار، صحیح سالم ٹھیک اِس کونے میں اِس بنچ پر آ پہنچتا۔ میری خواہش تو بھئی بس اِتنی سی ہے۔"

بقیہ لوگوں نے دنگ ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔
"اور اِس خواہش سے تمھیں کیا فائدہ پہنچتا؟" کسی نے پوچھا۔
"میرے پاس ایک قمیص ہوتی۔" جواب تھا۔

انگریزی سے ترجمہ ؛ محمّد عمر میمن

(٨) حسید یہودیوں کے ایک فرقے کا نام ہے۔ یہ دوسری صدی ماقبلِ مسیح میں ظہور پذیر ہوا۔ یہ مذہبی قوانین کی پابندی اور مذہبی آداب و رسوم کی ادائیگی میں غلو سے کام لیتا تھا۔

Scanned with CamScanner

[illegible]

کی تحریروں کا نیا مجموعہ

برج خموشاں

سیفورٹین

سی ۱۳ شہربانو پلازہ فیڈرل بی ایریا کراچی

محمد عمر میمن

کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ

تاریک گلی

ناشر : سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

صابر ظفر

کا نیا مجموعۂ کلام

دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے

ناشر : مکتبۂ دنیا، کراچی

اسما راجا

نظم

تمھارا دل صاف نہیں ہے
تمھارے خوبصورت ہاتھوں کی طرح
اور تمھارا ذہن بھی ملبوس نہیں جسم کی طرح
تم زمیں پر ننگے پاؤں چلتے ہو
اور چیونٹیوں کے بل پانی سے بہا دیتے ہو
تم جنازے کو کندھا دیتے ہو
مگر نفرتوں پر مٹی نہیں ڈالتے
تم لوگوں کو اپنی فلسفیانہ موشگافیوں سے مرعوب کر دیتے ہو
اور کولھو کے بیل کی طرح اپنے ہی مرکز پر گھومتے ہو
تم اپنی بڑائی کے عظیم الشان محل تعمیر کرتے ہو
اور ان کی دیواروں میں لوگوں کو چن دیتے ہو
پھر ایک دن ایسا آتا ہے
جب تمھاری پھینکی ہوئی ہڈی
کتا نہیں اٹھاتا

Scanned with CamScanner

نظم

جب میں نظم لکھنے لگتی ہوں
تو خیال میرے ہاتھ سے نکل جاتا ہے
جب میں تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی ہوں
تو گھٹن اور بھی بڑھ جاتی ہے
جب میں پھول کاڑھتی ہوں
تو ریشم الجھ جاتا ہے
تصویر بنانے لگتی ہوں
تو رنگ پھیکے پڑ جاتے ہیں
جب میں اس سے ملنا چاہتی ہوں
تو چاند ڈوب جاتا ہے
سفر کے لیے نکلتی ہوں
تو راستے گم ہو جاتے ہیں
جب میں ایک گھر بنانے کا سوچتی ہوں
تو میرے خیالوں میں ایک قبر بننے لگتی ہے

ہوموفوبیا

میں خوف زدہ ہوں
گدھوں سے اور لومڑوں سے
ایسے انسانوں سے جن کی گردن پر دس سر ہوتے ہیں
اور جن کی اکلوتی آنکھ بھی ان کے ماتھے پر لگی ہوتی ہے
ایسی عورتوں سے
جن کے پیر مڑے ہوتے ہیں
میں خوف زدہ ہوں کینچلی سے
کہ پھر پہچاننے میں عمریں گزر جاتی ہیں
میں خوف زدہ ہوں
اک اور خوں میں ڈوبے شہروں سے

وقت کے الٹ پڑنے سے
میں خوف زدہ ہوں
بےبسی کی موت اور جیے جانے کے جبر سے
اور اتنے بہت سے خوفوں کے درمیان
پلنے والی روح سے

ایک محبت

میں نے اس کا منہ چڑایا
اسے تنگ جوتے پہنا دیے
اسے ٹھوکر مار کر زمیں پر گرا دیا
پھر بھی جب وہ اٹھ کھڑی ہوئی
تو میں نے ایک موٹا رسّا اس کے گلے میں ڈال کر پنکھے سے لٹکا دیا
اور انہماک سے اسے مرتا ہوا دیکھنے لگی
اسے مرتے ہوئے کئی برس گزر گئے ہیں
مگر اس نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا
وہ میرا منہ چڑاتی ہے
مجھے ٹھوکر مار کر گرا دیتی ہے
اور پھر روز میرے مرنے کا تماشا دیکھتی ہے

rekhta

Scanned with CamScanner

آج

خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر بنرجی　ستیہ جیت رے　اسد محمد خاں
محمد خالد اختر　ڈونلڈ بارتھیم　ولیم سیرویاں
افضال احمد سید　ذی شان ساحل　نسرین انجم بھٹی
سعیدالدین　نیّر مسعود　فروغ فرخ زاد　بابا مقدّم

سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ　لیو تالستائی　کیم مونرو
مظفر علی سید　فہمیدہ ریاض　عذرا عباس
احمد فواد　محمد خالد اختر　اکرام اللہ

بہار ۱۹۹۰

اٹالو کلوینو　امین مالوف　محمد عمر میمن
محمد سلیم الرحمن　جیک لنڈن　محمد انور خالد
زیبا الیاس　محمد خالد اختر　تادیوش روزیوچ
زبگنیو ہربرٹ　وسلاوا شمبورسکا　الیگزانڈر وات

گرما ۱۹۹۰

وجے ڈان دیتھا　انور خاں
حسن منظر　محمد سلیم الرحمن
شمس الرحمن　شمس الحق
فہمیدہ ریاض

خزاں ۱۹۹۰

منوچہر خسروشاہی　بابا مقدّم　جمال میرصادقی
ثروت حسین　ذی شان ساحل　اوکتاویو پاز
یہودا امیخائی　جولین بارنز　فاروق خالد
محمد خالد اختر　علی امام نقوی
خورخے لوئس بورخیس

آج

سالانہ خریداری

اندرونِ ملک

چار شماروں کی قیمت ۱۰۰۰ روپے

آج کی کتابیں

بی ۱۳۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی

بیرونِ ملک

امریکا اور کینیڈا کے لیے

چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۲۰۰ امریکی ڈالر

بھیجنے کا پتا:

Prof. Muhammad Umar Memon
5417, Regent Street
Madison, Wisconsin 53705
U.S.A.

انگلینڈ اور باقی ممالک کے لیے

چار شماروں کی قیمت (بشمول ہوائی ڈاک خرچ وغیرہ) ۱۵۰ پاؤنڈ

بھیجنے کا پتا:

Ms. Shabana Mahmud
52, Queen's Road
Wimbledon
London SW19 8LR
England.

وِلاس سارنگ

وِلاس سارنگ

ولاس سارنگ نئے ہندوستانی فکشن کی چند منفرد ترین آوازوں میں سے ایک ہیں۔ مراٹھی زبان میں ان کی تحریریں کسی بھی اور ادیب کی تحریروں سے میل نہیں کھاتیں۔ یہ حقیقت، اور سارنگ کے موضوعات اور اسلوب کی فردیت پسندی غالباً اس کا باعث ہے کہ سارنگ ادب کی تمام اجتماعی تحریکوں سے الگ تھلگ رہے ہیں۔

سارنگ کی کہانیوں میں ان کے بین الاقوامی ادب کے مطالعے کے اثرات کو محسوس کرنا بےحد آسان ہے، لیکن انھوں نے ان اثرات کا سامنا کرتے ہوئے اپنا انفرادی اسلوب وضع کیا ہے۔ کافکا اور بورخیس کو اپنے پیرووں کی کمی کا شاید کبھی گلہ نہ ہو گا لیکن ان پیرووں میں کم ہی ایسے ہوں گے جو ان کے گھنے سائے تلے بھی اپنے انداز میں پنپ سکیں۔ سارنگ کو پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ وہ ان معدودے چند ادیبوں میں سے ایک ہیں۔

سارنگ کی تحریروں میں، نقطۂ نظر کی بنیادی یاسیت کے باوجود، ایک فراواں تخیّل سے کام لینے کی خواہش اور کہانی لکھنے کی تکنیک کے نت نئے تجربے ایک ایسی خوش دلی کا پتا دیتے ہیں جو فکشن کے فن سے گہرے انہماک سے پیدا ہوتی ہے۔

ولاس سارنگ ۱۹۴۲ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۶۹ میں بمبئی یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ڈاکٹریٹ کیا۔ ان کا موضوع ڈبلیو ایچ آڈن کے اسلوب کا مطالعہ تھا۔ ڈاکٹریٹ کی ایک اور ڈگری انھوں نے امریکا کی انڈیانا یونیورسٹی سے حاصل کی اور ۱۹۸۸ سے بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی ادب کے سربراہ ہیں۔

سارنگ نے پچیس کے لگ بھگ کہانیاں لکھی ہیں۔ ان میں سے بیس کہانیوں کے انگریزی ترجموں کا مجموعہ *Fair Tree of the Void* ۱۹۸۸ میں پینگوئن انڈیا نے شائع کیا۔ زیرِ نظر انتخاب میں شامل چار کہانیاں تکنیک کی اس رنگارنگی کا احاطہ کرنے کے لیے ناکافی ہیں جو اس مجموعے کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ سارنگ کی مزید کہانیوں کے ترجمے آئندہ شماروں میں پیش کیے جائیں گے۔

ولاس سارنگ کی کہانیوں کے ترجمے انگریزی کے علاوہ فرانسیسی میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کہانیوں کے علاوہ انھوں نے نظمیں، تنقیدی مضامین اور ایک ناول بھی تحریر کیا ہے۔

Scanned with CamScanner

ولاس سارنک

واپسی

اپنے اعضا اور ذہن کو سکون پہنچانے کے مختلف طریقے آزماتا وہ بستر میں کروٹیں بدلتا رہا۔ تکیے کو ایک طرف پھینک کر اس نے سر کو بستر پر سیدھا رکھ کر سونے کی کوشش کی۔ اس سے بھی کام نہ بنا تو اس نے کمبل سر تک کھینچ لیا۔ لیکن جب دم گھٹنے لگ تو اسے پھر سر سے نیچے کر لیا۔ وہ زرد روشنی کے اس مستطیل کو گھورنے لگ جو گلی کے لیمپ سے دیوار پر پڑ رہا تھا۔ لیمپ کے اردگرد پتنگے چکر کاٹ رہے ہوں گے۔ کیوں کہ دیوار پر روشنی کے اس ٹکڑے میں دھندلے سے سائے گھوم رہے تھے۔ یہ سوچ کر کہ اس روشنی ہی کی وجہ سے نیند نہیں آ رہی، اس نے پردے کھینچ دیے۔ جس سے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ بہت دیر اسی طرح گزری۔ پھر وہ بستر سے اٹھ کر شیلف پر گلاس کو ٹٹولنے لگا۔ اس نے کمرے میں لگے بڑے سنک سے گلاس میں پانی بھرا اور پینے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر اٹھا اور غسل خانے گیا۔ کافی دیر بعد، وہ اٹھ کر کچھ پڑھنے لگا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد وہ اس امید میں پھر بستر پر لیٹ گیا کہ شاید نیند آ جائے۔ دیر تک یہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ وہ جاگ اٹھا۔

لمحے بھر کے لیے سدھیر کو حیرت ہوئی کہ یہ سب کتنا حقیقی لگ رہا تھا۔ اسے واقعی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ وہ شدید بےخوابی میں مبتلا ہے۔ خواب کتنا طویل رہا ہو گا؟ اسے لگا کہ وہ شاید ساری رات خواب دیکھتا رہا ہے۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ خواب چاہے کتنا ہی طویل محسوس ہو، اس کی طوالت درحقیقت صرف چند سیکنڈ بھی ہو سکتی ہے۔ شاید اس سے پہلے خواب جاگنے سے صرف ذرا دیر پہلے ہی دیکھا ہو۔ اس نے دیوار گھڑی پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ الارم بجنے والے ہیں۔ وہ حقیقت میں معمول سے زیادہ دیر سویا تھا۔

غسل خانے میں سدھیر نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں کچھ جل سی رہی ہیں۔ اس پر نقاہت طاری تھی جیسے اس نے واقعی بےخوابی میں رات کاٹی ہو۔ خواب میں گزارے ہوئے

بےخوابی کے ایسے واضح اثرات حیران کن تھے۔ تب سدھیر کو خیال ہوا کہ اسے فوراً کسی گڑبڑ کا شبہ ہو جانا چاہیے تھا، کیوں کہ اسے کبھی بےخوابی کی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ کیرن، جو نیند کی گولی کے بغیر شاذونادر ہی سو پاتی تھی، اس سے کہا کرتی تھی، "یہ کیا بات ہے کہ تمہیں سونے میں کبھی دشواری نہیں ہوتی؟ مجھے پتا ہے تمہارے پاس فکرمند رہنے کے لیے بہت سی باتیں ہیں، لیکن لگتا ہے وہ کبھی تمہارے رات کے آرام میں مخل نہیں ہوتیں"۔ اس پر سدھیر ہنس کر کہتا، "یہ اپنے آپ کے ساتھ سکون سے رہنے کی مشرقی صلاحیت ہے۔ جو کچھ تم امریکی نئی ایج اور کرشنا کانشس نس کی قسم کی چیزوں کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے ہو، وہ مجھے فطری طور پر حاصل ہے"۔ تو اسے اس خواب کی اصلیت کا فوراً ہی پتا چل جانا چاہیے تھا۔ لیکن کیا کسی شخص کے لیے اپنے خواب پر شک کرنا ممکن ہے، جب کہ وہ نیند میں ہو؟ سدھیر سوچنے لگا۔

غسل خانے سے نکل آنے کے بعد بھی وہ خواب دیر تک سدھیر کے ذہن سے چمٹا رہا۔ اس میں کوئی بڑی خلاف معمول بات تھی، لیکن وہ اس بات کو پا نہ سکا۔ پھر اچانک وہ اسے جان گیا۔ خواب نے اسے دس سال پہلے بمبئی میں گزاری ہوئی زندگی میں واپس پہنچا دیا تھا۔ جس کمرے میں وہ رات بھر کروٹیں بدلتا رہا تھا، وہی تھا جس میں وہ ایم اے کے طالب علم کی حیثیت سے کرایہ دار رہا تھا۔ اس کمرے میں بھی، خواب والے کمرے کی طرح، ایک کونے میں واش بیسن تھا، اور، خواب ہی کی طرح، گلی کے لیمپ کی روشنی دیوار پر ایک مستطیل کی شکل میں پڑا کرتی تھی۔ خواب والا کمرہ یقیناً وہی پرانا کمرہ تھا، ورنہ امریکا آنے کے بعد وہ کب ایسے کسی کمرے میں سویا تھا جس میں واش بیسن لگا ہوا ہو۔ لیکن یہ حیران کن بات تھی کہ بمبئی کا وہ بوسیدہ کمرہ اتنے برس بعد اس خواب میں دوبارہ نمودار ہو جائے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کمرہ، اس کی اُس زمانے کی زندگی کی بہت سی اور چیزوں کی طرح، فراموشی میں گم ہو چکا ہے۔ لیکن اب وہ ایک بار پھر اس کے ذہن کے کسی کونے سے نکل کر، اپنی تمام تفصیلوں سمیت، سطح پر ابھر آیا تھا۔ کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اتنے برسوں بعد بالآخر ہندوستان واپس جا رہا ہے؟ شاید اس کا ذہن ماضی سے اپنے رشتے بحال کرنے کی کوشش میں ہے۔

سدھیر نے ایک بار پھر اپنے سوٹ کیس کا جائزہ لیا، حالانکہ وہ پچھلے روز اپنے اطمینان کے مطابق سامان باندھ چکا تھا۔ اس نے اپنے ذہن میں پھر سے تمام چیزوں کو دوہرایا، یہ جاننے کے لیے کہ وہ کوئی چیز بھول تو نہیں رہا۔ آخر وقت میں بھاگ دوڑ کرنا یا کوئی کام بھدے طریقے سے کرنا اسے پسند نہ تھا۔ ساڑھے نو بجے سدھیر نے کیرن کو یفنو میں لونگ ڈسٹنس کال کی اور کوئی بیس منٹ تک بات کرتا رہا۔ "اگر ہندوستان سے اکتا جاؤ تو پھر واپس چلے آنا"۔ کیرن نے کہا۔ ریسیور رکھنے پر اسے اچانک احساس ہوا کہ اس نے کیرن کی آواز غالباً زندگی میں آخری بار سنی ہے۔

وہ کوئی گھنٹے بھر تک اپنی پسندیدہ کرسی میں ٹانگیں دراز کیے بیٹھا رہا۔ تب ابھی جیت

Scanned with CamScanner

پھر بھی جلدی کرنا اچھا رہے گا۔" "میں بالکل تیار ہوں۔ تمہارا انتظار کروں گا"۔ سدھیر نے کہا۔

ابھی جیت کے ساتھ پیٹریشیا بھی الوداع کہنے چلی آئی۔ جب اس نے سدھیر کو گال پر چوما تو وہ کچھ شرما گیا۔ اس ملک میں آٹھ برس رہنے پر بھی وہ اس کا عادی نہ ہوا تھا؛ اس کے ذہن میں، اندر کہیں، ہندو روایات ابھی زندہ تھیں۔

پیٹریشیا کو راستے میں اتار کر وہ دونوں نیویارک جانے والی سڑک پر ہو لیے۔ سدھیر نے ابھی جیت کو اپارٹمنٹ کی چابی، ٹیلی فون کے بل اور ایسی ہی دو چار چھوٹی موٹی چیزوں کے بارے میں یاد دلایا۔ "فکر مت کرو"۔ ابھی جیت بولا۔ "میں سب دیکھ لوں گا"۔

وہ ایک میکڈونلڈ پر ہیمبرگر کھانے کو رکے۔ "دی لاسٹ گریٹ امیریکن میل" سدھیر نے بناوٹی بلندآہنگی سے کہا۔ ابھی جیت ہنسنے لگا۔ سدھیر نے بڑے سے سائن کی طرف دیکھا جس پر لکھا تھا "سیوں بلین سولڈ"۔ میں واپس ہندوستان میں ہوں گا اور یہ لوگ اپنے ملین اور بلین بیچتے رہیں گے۔ سدھیر نے سوچا۔

ابھی جیت خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ سدھیر بھی کچھ نہ بولا۔ اس کی پلکیں نیم‌خوابی کے احساس سے بوجھل تھیں، اور کار کی رفتار سے اس پر اور بھی غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ پھر ابھی جیت بولا۔ "وہاں پہنچ کر خط ضرور لکھنا۔ صرف یہ بتا دینا کہ تم ٹھیک ٹھاک ہو۔ ملک کے حالات کے بارے میں کچھ نہ لکھنا، ورنہ خط پہنچ نہیں سکے گا۔"

"تم بہت قنوطی ہو" سدھیر نے کہا۔ "اب اتنی سختی نہیں ہے۔"

ابھی جیت نے اپنے کندھے اچکائے۔

"پھر تمہارا تو واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں" سدھیر نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ تمہارا معاملہ تو خیر ٹھیک ہے۔ لیکن میں تو فری انڈیا کا سرگرم کارکن رہ چکا ہوں۔ میری واپسی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کم از کم جب تک حکومت تبدیل نہ ہو جائے۔"

درحقیقت وہ یہ باتیں پہلے بھی کئی بار کر چکے تھے۔

سدھیر کے جہاز نے کینیڈی ایرپورٹ سے ساڑھے چار بجے پرواز کی۔ وہ بوئنگ ۷۴۷ میں پہلی بار سفر کر رہا تھا۔ آٹھ سال پہلے جب وہ بمبئی سے نیویارک روانہ ہوا تھا تو ۷۴۷ عام نہ ہوئے تھے۔ سدھیر کو قطار میں درمیان والی سیٹ ملی۔ سیٹوں کی ہر قطار اتنی لمبی تھی کہ دونوں طرف کی کھڑکیاں کافی دور تھیں۔ سدھیر کو یہ جہاز بالکل پسند نہ آیا۔ اس کا واحد مقصد شاید یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ایک ساتھ ٹھونسا جا سکے۔ ویسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، کیونکہ وہ صرف سونا چاہتا تھا۔ برابر والی سیٹ پر بیٹھے ہوئے مسافر سے درخواست کر کے کہ وہ ایر ہوسٹس کو بتا دے کہ اسے جگایا نہ جائے، سدھیر نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب وہ جاگا تو جہاز لندن پہنچ رہا تھا۔ وہ اپنی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور منھ دھونے چل دیا۔ جب نیچے اترتے ہوئے جہاز ذرا سیدھا ہوا تو سدھیر کو ہزاروں روشنیوں سے جگمگاتے لندن شہر کا دلکش منظر دکھائی دیا۔ خوش قسمتی سے اسے لندن سے

آگے کی اچھی فلائٹ مل گئی تھی، اس لیے اسے ایرپورٹ پر زیادہ طویل انتظار نہ کرنا پڑا۔

اس جہاز میں اسے کھڑکی کے پاس والی سیٹ ملی۔ لندن کے وقت کے مطابق صبح کے چار بج چکے تھے، لیکن پچھلی پرواز پر اچھی طرح سو چکے ہونے کی وجہ سے سدھیر جاگتا رہا۔ باہر ابھی تک اندھیرا تھا۔ وہ سوچ میں گم، خالی پن سے اندھیرے میں تکتا رہا۔

امریکا میں آٹھ طویل سال، اور اب بالآخر سدھیر گھر واپس جا رہا تھا۔ امریکا جاتے وقت اس نے نہیں سوچا تھا کہ اس کا قیام اتنا طویل ہو گا۔ لیکن اسے وہاں سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ ہندوستان میں فوجی انقلاب آ گیا۔ سدھیر نے ابھی جیت سے، جو ہندوستان سے تازہ وارد ہوا تھا، پوچھا، "آخر یہ ہوا کیسے؟ مجھے تو کبھی گمان بھی نہ ہوا تھا کہ ہندوستان میں ایسا ہو سکتا ہے۔ میں سوچا کرتا تھا کہ ہندوستان کے لوگ فوجی حکومت کو کبھی برداشت نہیں کریں گے"۔

"بات یہ ہے"، ابھی جیت نے کہا، "کہ جب تک ایسا واقعی ہو نہ جائے لوگ اسی طرح سوچتے ہیں۔ جب یہ انقلاب حقیقت بن جاتے تو وہی لوگ جو پہلے کہا کرتے تھے کہ وہ آمریت کے تسلّط میں نہیں رہ سکتے، زبان بند کر لیتے ہیں اور پہلے کی طرح اپنی مصروفیات جاری رکھتے ہیں، جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اور پھر ہندوستان میں ایسی کیا خاص بات ہے؟ یہاں کے غیرملکی طلبا کو دیکھو۔ افریقی، لاطینی امریکی، مشرقِ وسطیٰ اور جنوب مشرقی ایشیا سے تعلق رکھنے والے۔ تقریباً سب ہی کے ملکوں میں کسی نہ کسی طرح کی آمریت قائم ہے۔ ہندوستان میں بھی ایک نہ ایک ایسا ہونا تھا۔"

پہلے پہل امریکا میں مقیم ہندوستانیوں کی طرف سے فوجی انقلاب پر کوئی زوردار ردعمل نہ ہوا۔ لیکن جوں جوں وہاں سے جبر کی اطلاعات آنے لگیں، احتجاج کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ان ہندوستانیوں نے جو امریکا میں ملازمت کرتے تھے، اور جنھیں تارکینِ وطن کا درجہ حاصل ہو چکا تھا، زیادہ تشویش کا مظاہرہ نہ کیا، لیکن طلبا کے احتجاج نے شدّت اختیار کر لی۔ کئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی طلبا کی انجمنوں نے ان واقعات کی مذمّت کی۔ حتیٰ کہ امریکا میں مقیم ہندوستانی طلبا کی ایسوسی ایشن کے عہدےداروں نے بھی سخت الفاظ میں تنقید کی۔ اس پر ہندوستانی سفارت خانے نے دباؤ ڈلوا کر انھیں عہدوں سے ہٹوا دیا اور ایسوسی ایشن کے خطرناک ہو جانے کی پیش بندی کر لی۔ باغی طلبا نے "فری انڈیا" کے نام سے ایک نئی انجمن قائم کر لی۔ انھوں نے کتابچے اور پوسٹر تقسیم کرنے شروع کر دیے جن میں ہندوستانی حکومت کے جابرانہ اقدامات کی تشہیر کی گئی تھی۔ سدھیر، جسے سیاست سے زیادہ دلچسپی نہ تھی، لمحاتی جوش میں تحریک میں شامل ہو گیا لیکن سال بھر میں اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

جلد یا بدیر ہر ہندوستانی طالبِ علم کو واپسی کے امکان کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بغاوت کے پہلے اُبال میں ان میں سے بہت سے نئی حکومت کی مخالفت میں بہت بلندآہنگ رہے تھے،

Scanned with CamScanner

جائیں گے۔ ان کی توقعات کے برخلاف، نئی حکومت کی گرفت ملک پر مضبوط ہوتی چلی گئی۔ اب کوئی کس طرح واپس جا سکتا تھا؟ یہاں تک کہ وہ بھی جنھوں نے مخالفت میں حصہ نہیں لیا تھا واپسی پر آمادہ نہ تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ بدلے ہوئے حالات میں زندگی دشوار ہو گی اور ان کی پیشہ ورانہ زندگی متاثر ہو سکتی ہے۔ اس سے بھی بدتر امکانات کا سامنا ان لوگوں کو تھا جو مخالفت میں پیش پیش رہے تھے۔ ایسے چند طلبا جب ہندوستان واپس گئے تو پھر ان کی کوئی خبر نہ آئی۔ افواہیں گرم تھیں کہ انھیں جیل میں ڈال دیا گیا اور ان پر تشدد کیا گیا۔ سیاست سے دور رہنے والے طلبا بھی اس قسم کی خبروں کے باعث خوف زدہ تھے۔ چونکہ طلبا کی اکثریت مخالفت کی تحریک میں شامل رہ چکی تھی، اس لیے حکام واپس آنے والے تمام طلبا کو مشکوک گردانتے تھے۔ اس وجہ سے ہر ایک کے لیے واپس جانا مشکل ہو گیا۔

لیکن امریکا میں رک جانے کی مشکلات اپنی جگہ تھیں۔ جن لوگوں کے پاس اسٹوڈنٹ ویزا تھے، ان سے ان کی تعلیم مکمل ہوتے ہی واپسی کی توقع کی جاتی تھی۔ نوکری حاصل کرنا آسان نہ تھا۔ امریکا میں روزگار کی صورتحال بدتر ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت نے غیرملکی طلبا کو تارکینِ وطن کا درجہ دینا کم و بیش بند کر دیا تھا۔ سدھیر نے پی ایچ ڈی کے لیے کام ساڑھے چار سال میں پورا کیا اور درجنوں کے حساب سے ملازمت کی درخواستیں بھیجنی شروع کر دیں؛ کچھ کام نہ بنا۔ اس کا میدان ریاضی تھا اور اس میں لگتا تھا پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے والوں کی بھرمار ہے۔ اپنا مقالہ مکمل کرنے کو ملتوی کر کے سدھیر ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اس دن سے ڈر رہا تھا جب سے یونیورسٹی کو خیرباد کہنا پڑے گا۔

فنڈز میں کمی کی وجہ سے یونیورسٹی نے مالی معاونت میں کٹوتی شروع کر دی۔ چونکہ سدھیر کو یہ معاونت چار سال تک حاصل رہی تھی، اس کے شعبے نے اسے بتایا کہ اسے مزید جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ اسے جزوقتی ملازمت تلاش کرنی پڑی۔ اس نے کچھ عرصے تک ایک کیفیٹیریا میں کام کیا، پھر اسے یونیورسٹی کی لائبریری میں ملازمت مل گئی۔ یہ لائبریری ایک بہت بڑی ماچس کی ڈبیا کی طرح تھی؛ کشادہ وسیع منزلیں کتابوں سے بھری ہوئی، اور کسی میں کوئی کھڑکی نہ تھی۔ ایک بار لائبریری میں داخل ہونے کے بعد کچھ پتا نہ چل سکتا تھا کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا برف پڑ رہی ہے، یا باہر کی تمام دنیا نیست و نابود ہو چکی ہے۔ سدھیر کا کام میزوں پر بکھری کتابوں کو ٹرالی میں جمع کرنا اور اپنی اپنی جگہ شیلفوں میں لگانا تھا۔ بےشک، یہ بڑا اکتا دینے والا کام تھا، لیکن اس میں کام چوری کے بہت موقعے تھے۔ کتابوں کی قطاروں کے پیچھے چھپ کر آدمی مطالعے میں گم ہو سکتا تھا، اور سپروائزر کے اچانک نمودار ہو جانے پر خود کو مصروف ظاہر کر سکتا تھا۔ سدھیر اس دوران میں ایسی بہت سی کتابوں سے واقف ہوا جن سے اس کی پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی — تاریخ جغرافیے وغیرہ کی

کتابیں۔ جغرافیے کی بڑی بڑی مصور کتابیں ورق گردانی کے لیے خاص طور پر دلچسپ تھیں۔ سدھیر کو اپنی یہ کام انتشار کی قوتوں کے خلاف ایک نہ ختم ہونے والی جدوجہد کی طرح لگتا۔ ہر چیز کو اس کی مقررہ جگہ پر پہنچا کر گویا وہ اس بند کائنات میں ایک ترتیب قائم کرنے کی کوشش میں رہتا تھا اور لوگ آ کر کتابیں نکال نکال کر انتشار پیدا کرتے تھے۔ اور اس طرح یہ کش مکش جاری تھی۔ کبھی کبھی سدھیر خواب سا دیکھتا کہ تمام کتابیں اپنی اپنی جگہ آرام سے رکھی ہوئی ہیں، اس کی کائنات میں مکمل ترتیب قائم ہو چکی ہے اور پوری عمارت میں اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ سدھیر کتابوں کی قطاروں کے درمیان سے پُرسکون انداز میں چہرے پر بدھ کی سی مسکراہٹ لیے گزر رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے نروان کی یہ کیفیت کبھی حقیقت نہ بن سکی۔

مہینے اسی طرح گزرتے رہے، اور یوں ہی سال۔ سدھیر یونیورسٹی سے چمٹا ہوا صرف وقت گزارتا رہا۔ وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اس فضول سی ملازمت میں ضائع کرنے پر اکثر تلخی سے بھر جاتا۔ اگر وہ ہندوستان واپس چلا جاتا تو اسے ایک اچھی تدریسی ملازمت مل سکتی تھی، اور پھر وہ کب تک اس صورتِ حال کو جاری رکھ سکتا تھا؟ تارکِ وطن کا درجہ حاصل کرنے اور یہاں مستقل رہ جانے کا ایک طریقہ یہ تھا کہ وہ کسی امریکی لڑکی سے شادی کر لے۔ بہت سے ہندوستانیوں نے، ابھی جیت سمیت، یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ ابھی جیت سدھیر سے کہا کرتا تھا، "تم کیری سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کب تک اس غیریقینی کیفیت میں رہتے رہو گے؟"

سدھیر کو یونیورسٹی میں سات سال ہو چکے تھے، جو پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ مدت تھی۔ اسے ایک سال فاضل بھی دیا گیا؛ لیکن یہ سلسلہ مزید جاری نہ رہ سکتا تھا۔ اسے جلد ہی ڈگری حاصل کر کے روانہ ہو جانا ہو گا۔ معاملات اب خاتمے کے قریب تھے۔ سدھیر ایک بنگلادیشی طالب علم کو جانتا تھا جس نے فزکس میں پی ایچ ڈی کی تھی اور اب غیرقانونی طور پر امریکا میں رہ کر ٹیکسی چلا رہا تھا۔ کیا اسے بھی یہی کرنا ہو گا؟ لیکن غیرقانونی طور پر رہنے میں گرفتاری کا خطرہ ہمیشہ موجود رہتا تھا جس کا وہ سامنا نہیں کر سکتا تھا۔

تب ہندوستان میں قیادت کی تبدیلی کی خبر آئی۔ اقتدار سنبھالنے والے نئے جنرلوں نے لبرل پالیسی کا اعلان کیا۔ اب کسی کو مقدمہ چلائے بغیر جیل میں نہیں ڈالا جائے گا۔ صدر نے بیرونِ ملک مقیم ہندوستانی طلبا سے خاص طور پر کسی اندیشے کے بغیر وطن واپس آنے کی اپیل کی؛ ملک کو ان کی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، ان کی تعلیمی کامیابیوں کا انعام دیا جائے گا، ان کے سیاسی پس منظر کو نظر انداز کر دیا جائے گا؛ جو لوگ واپسی پر سیاست میں ملوث نہ ہونے کی یقین دہانی کرائیں گے انھیں ماضی کی سرگرمیوں کے سلسلے میں معافی دے دی جائے گی۔

لوگ ان اعلانات کے قابلِ اعتبار ہونے کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کچھ نے اس پر یقین کیا؛ ان کی دلیل یہ تھی کہ فوجی حکومت کو ایک بہتر تاثر قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے لوگ، مثلاً ابھی جیت، کہتے تھے، "یہ صرف دکھاوا ہے۔ اس پر ذرا بھی یقین نہیں کرنا چاہیے۔"

Scanned with CamScanner

سدھیر نے صبر سے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے۔ اس نے بعض دوسرے شہروں سے کچھ لوگوں کے واپس جانے کی خبر سنی۔ واپسی پر انھیں مصیبت کا سامنا کرنا پڑا یا نہیں، اس کے بارے میں متضاد اطلاعات تھیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ان کے بارے میں کوئی اطلاع ہی نہیں ملی۔ سدھیر نے بعض دوستوں کو وطن خط لکھا لیکن ان کے جواب سے وہاں کے حالات کا کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔ اس نے ابھی جیت سے بات کی جس کا واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ "فری انڈیا" کے لیے سرگرمی سے کام کرنے کے نتیجے میں، ابھی جیت کو یقین تھا کہ واپسی پر اسے سزا دی جائے گی۔ سدھیر کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ "فری انڈیا" کا رکن ضرور رہا تھا مگر بہت تھوڑے عرصے کے لیے، اور اس کے بعد سے اس کا تحریک سے کوئی تعلق نہ رہا تھا۔ ہاں، ابھی جیت یقیناً اس کا قریبی دوست تھا، جس کی اس نے تحریک کے خبرنامے وغیرہ چھاپنے کے سلسلے میں ضرور مدد کی تھی۔

اس غیریقینی کیفیت میں سدھیر نے وطن کی کئی یونیورسٹیوں کو ملازمت کی درخواستیں بھیجیں۔ اسے بمبئی سے ایک پیش کش ملی۔ واپس جانے کی خواہش شدید تر ہو گئی۔ سدھیر نے خود کو آمادہ کر لیا کہ وہ اب تک بلاضرورت شک کا شکار رہا ہے اور یہ کہ اگر وہ اب واپس نہ گیا تو وہ بےبصتی کے ہاتھوں اس عمدہ موقعے کو گنوانے کے لیے اپنے سوا کسی کو الزام نہ دے سکے گا۔ چند دنوں تک اس کا ذہن ایک شدید کشمکش میں گرفتار رہا۔ تب اس نے بمبئی خط لکھ کر آنے کی اطلاع دی اور اسباب باندھنا شروع کر دیا۔

روم میں کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد جہاز بمبئی روانہ ہو گیا۔ چونکہ کھڑکی سے باہر دیکھنے کو کچھ نہ تھا اس لیے سدھیر رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔ جہاز سفید بادلوں کے اوپر پرواز کرتا رہا۔ لیکن مشرق وسطیٰ پر سے گزرتے ہوئے، سدھیر کو نیچے دور تک پھیلے ریگستان سے جلتی ہوئی گیس کے شعلے دکھائی دیے۔ یہ شعلے اس نے آٹھ سال پہلے، مخالف سمت میں سفر کرتے ہوئے بھی دیکھے تھے۔ اس وقت اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کیا ہے، اور وہ سمجھا تھا کہ نیچے مکانوں کو آگ لگ گئی ہے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان شعلوں کا تعلق تیل سے ہے، کیونکہ اس زمانے میں لوگوں کو مشرق وسطیٰ اور وہاں پائے جانے والے تیل کے بارے میں کم ہی معلوم تھا۔ بعد کے برسوں میں یہ عام گفتگو کا موضوع بن گئے تھے۔ وقت کیسے بدلتا ہے، سدھیر نے سوچا۔

ہندوستان میں یہ مون سون کا موسم تھا اور بمبئی کے قریب آتے آتے موسم بدلنے لگا۔ جب جہاز بادلوں میں گزرا تو پرواز ناہموار ہونے لگی۔ پھر سمندر پیچھے رہ گیا، اور اب جس وقت جہاز بادلوں سے باہر آتا تو زمین کی جھلک دکھائی دیتی۔ بمبئی کے پاس کی پہاڑیاں سبز زمرد کے رنگ کی لگ رہی تھیں، اور کھیت پانی سے لبریز تھے۔ ظاہر تھا کہ بہت دیر سے بارش ہوتی رہی ہے۔

جہاز اب ایرپورٹ کے قریب پہنچ رہا تھا اور نیچے اترنے لگا تھا۔ ایرپورٹ کے پاس کی

جھونپڑپٹیاں اب نظر آنے لگی تھیں۔ آٹھ سال بعد سدھیر ان کچی آبادیوں کو دوبارہ دیکھ رہا تھا۔ نئی حکومت کے دور میں ان میں بظاہر کوئی کمی نہ آئی تھی، بلکہ لگتا تھا وہ اور پھیل گئی ہیں۔ جب جہاز نے اترنے کے لیے دائرے میں چکر لگانے شروع کیے تو سدھیر توجہ سے باہر دیکھتا رہا۔ اچانک اسے ایک عجیب سی خواہش نے جکڑ لیا: "بومبے ڈک" کی خواہش نے۔ یہ مخصوص مچھلی بمبئی کے ساحل کے علاوہ اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ سدھیر سوچنے لگا کہ آیا یہ موسم بومبے ڈک کا ہے یا نہیں۔ آٹھ سال گزرنے کے بعد اسے کچھ یاد نہ آ رہا تھا۔ تب پہیوں کے زمین پر لگنے کی آواز آئی، جہاز سانتاکروز ایرپورٹ پر اتر چکا تھا۔

جیسے ہی سدھیر نے جہاز سے باہر قدم رکھا، اس کی ناک مرطوب، نمکین ہوا سے بھر گئی۔ اسے احساس ہوا کہ اس گرم اور مرطوب آب و ہوا کا عادی ہونے میں اسے کچھ عرصہ لگے گا۔ اس نے دیکھا کہ ایرپورٹ کی عمارت کو وسیع کر دیا گیا ہے۔ ایک سرے پر تعمیر کا کام ابھی جاری تھا۔ ایرپورٹ کے اندر معاملات پہلے کی بہ نسبت بہتر طریقے سے نمٹائے جا رہے تھے۔ کوئی چیز ماضی کی بےترتیبی اور کنفیوژن کی یاد نہ دلاتی تھی۔ چونکہ وہ ایک طویل عرصہ باہر گزار کر ہمیشہ یہاں رہنے کے لیے لوٹ رہا تھا، اس لیے سدھیر کو یقین تھا کہ کسٹم سے باہر نکلنے میں اسے زیادہ دشواری نہ ہو گی۔ تب اسے کسٹم سے پہلے ایک رکاوٹ نظر آئی جس پر "سکیورٹی چیک" کا اعلان درج تھا۔ سکیورٹی انسپکٹر نے سدھیر کے سامان کی اچھی طرح تلاشی لی۔ رسالے اٹھا کر وہ ان کے نام دیکھنے لگا: "سائنٹفک امیریکن"، "سائیکولوجی ٹوڈے"۔ اس نے انھیں رکھ دیا۔ پھر اس نے کیسٹ ٹیپ اٹھائے۔ "ان میں کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میوزک۔" سدھیر نے کہا۔ "زیادہ تر روک ہے۔ بوب ڈائلن وغیرہ۔" یہ پہلے سے ریکارڈ شدہ کیسٹ نہ تھے، انھیں سدھیر نے خود ریکارڈ کروایا تھا۔

"ہم انھیں چیک کریں گے۔" انسپکٹر بولا۔ "تین چار دن بعد آ کر لے جائیے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ آپ کو ڈاک سے بھیج دیے جائیں تو اپنا پتا چھوڑ جائیے۔" اس نے فوراً کیسٹوں کی رسید لکھ کر دے دی۔ پھر اس نے غور سے سدھیر کے پاسپورٹ کا معائنہ کیا۔ امریکا میں طالب علم۔ کتنے عرصے تک؟ آٹھ سال۔ آٹھ سال؟ ہاں۔

"مہربانی کر کے وہاں جا کر بیٹھ جائیے۔" انسپکٹر نے بائیں ہاتھ پر ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ پاسپورٹ ابھی میرے پاس رہے گا۔"

سدھیر نے اپنا سامان اٹھایا اور کمرے میں جا کر ایک طویل بنچ پر بیٹھ گیا جو کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے والے حصے میں بھی ایک اسی طرح کی بنچ تھی۔ کمرے کے بیچ میں ایک لمبی چوڑی میز رکھی تھی۔ اس وسیع کمرے میں اکیلا بیٹھ کر سدھیر مقابل کی دیوار پر لگی صدر کی تصویر کو تکنے لگا۔

آدھا گھنٹا گزر گیا مگر کوئی نہ آیا۔ سدھیر ناگواری سے بار بار گھڑی دیکھنے لگا۔ پندرہ منٹ اور گزر گئے۔ اس نے اٹھ کر باہر جانا چاہا تاکہ پتا چلے کہ کیا معاملہ ہے، مگر پھر کچھ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا۔ پسینا پونچھتا ہوا وہ بنچ کے ہتھے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ موں

Scanned with CamScanner

سوں کے اس چپچپاتے موسم میں اسے آرام سے بیٹھے ہوئے بھی پسینا آ رہا تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایک پولیس والا اندر داخل ہوا۔ "چلیے"، اس نے کہا۔

سدھیر کو ایک افسر کے کمرے میں لے جایا گیا۔ اس کا پاسپورٹ میز پر ایک موٹے رجسٹر کے پاس رکھا تھا۔ افسر کی کرسی کے پیچھے اسی طرح کے رجسٹروں کی ایک لمبی قطار رکھی تھی۔ اس قطار میں ایک رجسٹر کی جگہ خالی تھی۔ افسر نے کم و بیش وہی سوال پوچھے جو اس سے پہلے انسپکٹر پوچھ چکا تھا، لیکن اب کے زیادہ تفصیل سے۔ تب وہ اپنے سامنے رکھے رجسٹر میں منہمک ہو گیا۔ افسر کے گنجے ہوتے سر کو دیکھتے ہوئے سدھیر اچانک بولا۔ "مجھے جلدی یونیورسٹی پہنچنا ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ ٹرم دو ہفتے پہلے شروع ہو گئی ہو گی۔" پھر اسے فوراً خیال آیا کہ اس نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے۔ اس نے ایسا کیوں کہا؟ افسر نے اسے جانے نہ دینے کے بارے میں کچھ نہ کہا تھا۔

رجسٹر پر سے نظریں اٹھا کر افسر زور سے ہنسا۔ "اس کی فکر مت کیجیے۔" وہ بولا۔ "یونیورسٹی دو ہفتے سے بند پڑی ہے۔ اور اس کے جلد کھلنے کا کوئی امکان نہیں۔"

افسر کچھ دیر تک رجسٹر کے صفحے الٹتا رہا۔ پھر اس نے کسی کو پکارا۔ ایک سپاہی نے داخل ہو کر سلیوٹ کیا۔ "ان صاحب کو انکوائری بلاک میں لے جاؤ۔" افسر نے سدھیر کا پاسپورٹ اسے تھماتے ہوئے ہدایت کی۔

انکوائری بلاک زیادہ دور نہ تھا۔ سدھیر نے سنا تھا کہ ایئرپورٹ کے قریب ایک نیا فائیواسٹار ہوٹل تعمیر کیا گیا ہے۔ انکوائری بلاک ہوٹل کے بازو ہی میں تھا۔ وہیں سے سدھیر کو ہوٹل کی اونچی عمارت کی کھڑکیاں شام کی روشنی میں جھلملاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

انکوائری بلاک کے افسر نے سدھیر کا پاسپورٹ لے لیا اور ایک سپاہی کو بلا کر اس سے کچھ کہا۔ پھر وہ سدھیر کی طرف مڑ کر بولا، "یہ آپ کو اوپر لے جائے گا۔" سدھیر ایک لمحے کو ہچکچایا، پھر پوچھنے لگا، "کیا میں اپنا سامان ساتھ لے جا سکتا ہوں؟" "یقیناً!" افسر نے کہا، "یہ جیل نہیں ہے۔ اسے آپ ایک طرح ہوٹل سمجھیے۔"

سپاہی نے سدھیر کے لیے پہلی منزل کے ایک کمرے کا دروازہ کھولا، پھر بتایا کہ غسل خانہ کہاں ہے۔ جب وہ چلا گیا تو سدھیر نے دروازہ بند کر لیا اور مسہری کے کونے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جوتے اتار دیے اور بستر پر لیٹ گیا۔ سفر کی تھکن نے اچانک اس پر غلبہ پا لیا تھا۔ کمرے میں اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔

سدھیر بستر سے اٹھا اور بتی جلا دی۔ وہ کھڑکی کے پاس جا کر اس میں لگی جالی سلاخوں میں سے باہر دیکھنے لگا۔ احاطے کے باہر ایک کھلا ہوا نالا تھا اور اس کے پار جھونپڑیوں کی قطار شروع ہو جاتی تھی جہاں عورتیں رات کا کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ چھوٹے چھوٹے چولھے جل رہے تھے اور دھویں کی پتلی پتلی دھاریں اٹھ رہی تھیں۔ بچے جھونپڑیوں کے سامنے شور مچاتے ہوئے بھاگ رہے تھے۔ دور فاصلے پر فائیواسٹار ہوٹل کی

روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ شاید اس کی چھت پر بنایا گیا ریوالونگ ریستوراں ابھی کھلا نہ تھا، اس لیے کہ وہاں ابھی تک اندھیرا تھا۔

بستر پر لوٹ کر سدھیر نے ایک رسالہ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک بار اٹھ کر بال کے سر پر بنے ہوئے غسل خانے میں گیا۔ واپسی پر اسے وہی سپاہی راہداری کے سرے پر بیٹھا دکھائی دیا۔ اس کے سر کے بالکل اوپر بلب جل رہا تھا اس لیے اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا، لیکن اس کے سگریٹ سے اٹھتا ہوا دھواں چمکا رہا تھا۔

سدھیر کی گھڑی میں ابھی تک لندن کا وقت تھا کیونکہ وہ اسے ایئرپورٹ پر درست کرنا بھول گیا تھا۔ اس نے وقت کے فرق کا حساب لگایا اور سوئیاں گھمائیں۔ ساڑھے آٹھ بجے دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس نے کھانے کی تھالی رکھی اور ایک لفظ بولے بغیر واپس چلا گیا۔ سدھیر نے تھالی پر نظر ڈالی؛ روٹی، چاول، ایک پیالے میں دال اور کسی سبزی کی بھجیا۔ اس کا پہلا انڈین میل۔

دس بجے کے قریب سدھیر نے شب خوابی کا لباس پہنا اور بتی بجھا دی۔ جلدی سونا بہتر تھا۔ طویل سفر نے اسے تھکا دیا تھا۔ صبح تازہ دم ہونا فائدہ مند رہے گا۔ کوئی گھنٹے بھر بعد سدھیر کو غیرمعمولی طور پر پیاس لگی؛ وہ واش بیسن کے قریب گیا اور اس نے گلاس بھر کر پانی پیا۔ پھر وہ اندھیرے میں کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ جھونپڑیوں میں خاموشی چھا گئی تھی، اور ہوٹل کی چھت پر ریوالونگ ریستوراں کی بتیاں جل اٹھی تھیں۔ وہ گھومتا ہوا نظر نہ آتا تھا، لیکن کچھ دیر بعد سدھیر کو پتا چلا کہ وہ واقعی تھوڑا سا گھوم گیا ہے۔ ہوٹل کے ایک کمرے کی بتی بجھی اور فوراً دوبارہ روشنی ہو گئی، جیسے پلک جھپکی ہو۔ سدھیر کو لائبریری میں رات کی شفٹ میں کام کرنا یاد آیا۔ لائبریری آدھی رات کو بند ہوتی تھی، اور بند ہونے کے وقت سے کچھ پہلے اطلاع دینے کے لیے بتیاں تین بار جلائی بجھائی جاتی تھیں۔ باری باری تین دفعہ، گو صرف چند سیکنڈ کے لیے، ہر چیز اندھیرے میں ڈوب جاتی۔ سدھیر کبھی اس کا عادی نہ ہو سکا تھا۔ ہر بار ایسا ہونے پر وہ چونک پڑتا۔

بستر پر واپس آ کر سدھیر نے اپنی گھڑی کے چمکتے ہوئے ڈائل پر نظر ڈالی۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔ وقت کی تبدیلی کی وجہ سے اسے نیند آنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس کے اعضا آرام کے لیے بےتاب تھے، لیکن لگتا تھا جیسے اس کا جسم سکون کی کیفیت کو بھول چکا ہو۔ بہت دیر بعد وہ پھر اٹھا اور بتی جلا کر واش بیسن کے قریب گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھپاکے دیے، اور خشک کرتا ہوا بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کی گھڑی میں سوا دو بج چکے تھے۔ باہر بوندابانڈی ہو رہی تھی اور کسی جھونپڑی سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

بستر کے کنارے پر بیٹھ کر سدھیر کو احساس ہوا کہ اس کمرے میں کوئی عجیب سی بات ہے، لیکن وہ اس کا پتا نہ لگا سکا۔ تب اچانک اس پر انکشاف ہوا، واش بیسن والا کمرہ، بالکل خواب کے کمرے کی طرح! کمرہ پوری طرح خواب کے کمرے جیسا نہیں تھا، لیکن خواب

Scanned with CamScanner

سوا دس بجے میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوتا ہوں، ڈاکیے کے انتظار میں۔ ڈاکیا ساڑھے دس بجے کے قریب آتا ہے۔ اس کے پاس ہر بار میرے نام کا کوئی خط نہیں ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو مجھے خط پا کر بھی مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میرے یہاں آنے سے پہلے اس گھر میں ایک ڈاکٹر رہا کرتا تھا۔ اسے یہاں سے گئے تین برس ہو چکے ہیں؛ پھر بھی کئی دواساز کمپنیاں اس کے نام اپنا طبّی لٹریچر بھیجتی رہتی ہیں۔ ہفتے میں کم از کم دو بار مجھے اس قسم کی ڈاک موصول ہوتی ہے۔ میں دروازے کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں اور لفافہ وصول کرتا ہوں، اور اس میں ہوتا کیا ہے؟ ایسی طبّی مصنوعات کے حق میں سفارش جن کا میں نے نام بھی نہیں سنا ہوتا یا جن کا نام میں ادا بھی نہیں کر سکتا، "ٹینڈرل، سوجن اور جلن میں فوری آرام دیتی ہے"، "یوریکس ہائیڈروکورٹیزون؛ پیچیدہ جلدی امراض کا سادہ ترین علاج"، "کیناصینا؛ الرجی پر قابو پانے کا نسخہ"، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی چیزوں سے مجھے بڑی مایوسی ہوتی ہے۔ لیکن میں اتنی سرگرمی پیدا نہیں کر پاتا کہ ان کمپنیوں کو خط لکھ کر مطلع کر دوں کہ ڈاکٹر اب یہاں نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ کہ مجھے اس کی ڈاک موصول ہوتی رہتی ہے۔

بہرحال ایسے بھی موقعے آتے ہیں جب مجھے وہ خط ملتے ہیں جن کا مجھے انتظار ہو۔ کبھی کبھار تو مجھے بڑے غیرمتوقع خط ملتے ہیں۔ چند ماہ پہلے مجھے ایسا ہی ایک خط ملا۔ اس میں لکھا تھا:

۱۶ اکتوبر

ڈیر بابی پیلانکر...

میں جانتا ہوں تمھیں یہ خط پا کر حیرت ہو گی۔ غالباً تم مجھے بالکل بھول چکے ہو گے۔ چاہے میں تمھیں یاد ہوں یا نہ ہوں، میرا تمھیں یہ خط لکھنا نہایت ضروری ہے۔ یہ ایک رپورٹ کے بارے میں ہے جو میں آج کل تیار کر رہا ہوں۔

جنرل مینیجر کو یہ رپورٹ ۱۵ دسمبر سے پہلے پہلے چاہیے۔ جس کا مطلب ہے کہ میرے پاس اس پر کام کرنے کے لیے صرف دو مہینے ہیں۔ اس میں سے دس دن تو مجھے ٹائپنگ وغیرہ کے لیے رکھ لینے چاہئیں۔ ظاہر ہے میں اسے کسی اور سے تو ٹائپ کرا نہیں سکتا، اور میں خود صرف دو انگلیوں سے ٹائپ کر سکتا ہوں، اس لیے مجھے اس میں کافی وقت لگے گا۔

ویسے یہ میری پہلی رپورٹ نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی رپورٹیں تیار کی ہیں۔ لیکن اس طرح کی رپورٹ پر میں نے پہلے کبھی کام نہیں کیا۔ ہر چیز کا

چاہا۔ سب کچھ اب بالکل واضح تھا؛ وہ دوبارہ وہی خواب دیکھ رہا تھا۔ تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ وہی کہانی دوہرائی جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ خواب کبھی کبھی اس طرح خود کو دوہراتے ہیں۔ خود اس کا باپ کئی برس تک بار بار دکھائی دینے والے ایک خواب کی قید میں رہا تھا جس میں وہ خود کو مندر کی چوٹی پر بیٹھا ہوا پاتا اور اس کے قدموں کو سیلاب کا پانی چھو رہا ہوتا۔

وہ پچھلی بار کب سویا تھا؟ نیویارک سے لندن جانے والی پرواز پر۔ اور وہ اب تک سو رہا تھا۔ اس کے بعد پیش آنے والے سارے واقعات اس خواب کا حصہ تھے۔ بےچینی کا یہ خواب جو اس کی صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے بالکل فطری تھا۔ اچانک اسے بھرپور تسکین کا احساس ہوا۔ اب یہ سب کچھ دلچسپ لگ رہا تھا۔ اب اسے صرف اس خواب کا ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ خواب ختم ہو جائے گا، پھر وہ اٹھ کر منھ ہاتھ دھوئے گا اور جہاز کے اترنے کا انتظار کرنے لگے گا۔ وہ بتی بجھا کر پھر لیٹ گیا۔ جب کچھ دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔ دستک دوبارہ سنائی دی، اب کی زیادہ زور سے۔ سدھیر نے بستر سے باہر آ کر بتی جلائی اور دروازہ کھولا۔ ایک دبلا پتلا، درمیانی عمر کا آدمی، عینک پہنے، اسے دیکھ کر مسکرایا۔ "اچھا تو آپ جاگ رہے ہیں؟" وہ بولا۔ "میں سمجھا تھا آپ گہری نیند میں ہوں گے۔ میں ماسٹرکی اپنے ساتھ لایا تھا کہ شاید مجھے اندر جا کر آپ کو جگانا پڑے۔"

سدھیر نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چار بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ ایسے موقعوں پر، سدھیر نے سوچا، عموماً یونیفارم پہنے فولادی چہرے والے دو لمبے تڑنگے آدمیوں کو دیکھنے کی توقع ہوتی ہے۔ اس کے سامنے کھڑا آدمی تو کوئی چھوٹا موٹا کلرک لگتا تھا، جس نے ایک سستی سفید قمیض اور بہت استعمال کی ہوئی پتلون پہن رکھی تھی۔

"آ جائیے۔ ہمیں آپ سے کچھ سوال پوچھنے ہیں۔" وہ آدمی بولا۔ "آپ جانتے ہیں ایسے کام کے لیے یہی وقت ٹھیک رہتا ہے۔ ایک تو اس وقت کام جلدی ہو جاتا ہے۔ کپڑے بدل لیجیے۔ میں انتظار کرتا ہوں۔"

خواب کچھ زیادہ ہی پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے، سدھیر نے عینک والے آدمی کے پیچھے پیچھے ہال سے گزرتے ہوئے ناگواری سے سوچا۔ رات کی خاموشی میں، جیسے کسی خواب میں، وہ میکانیکی انداز سے چلتے رہے۔ ایک کمرے سے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ "لگتا ہے کوئی بیمار ہے، کیوں؟" سدھیر نے عام سے انداز میں کہا۔ عینک والے آدمی نے شاید سنا نہیں۔

سدھیر سوچنے لگا کہ اگر وہ زور سے چلائے تو شاید اس کی آنکھ کھل جائے گی اور وہ اس خواب کے چنگل سے آزاد ہو جائے گا۔ پھر وہ اٹھ کر دیکھے گا کہ لندن کتنی دور رہ گیا ہے۔ پھر سامنے ہزاروں روشنیاں جل اٹھیں گی اور جہاز ان کی طرف یوں بڑھنے لگے گا جیسے خلا میں کسی کہکشاں کی طرف جا رہا ہو۔

Scanned with CamScanner

مینیجر اس رپورٹ سے خوش ہو کر مجھے کسی اونچے عہدے پر ترقی دے دے گا۔ ویسے تو یہ بھی کون کہہ سکتا ہے کہ یہ رپورٹ جی ایم کو پسند آئے گی؟ کبھی کبھی تو وہ جلدی میں بنائی گئی، بےکار ناقص قسم کی رپورٹ ہی سے خوش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس بات پر اسے الزام نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ صرف وہی اس مقصد سے باخبر ہے جو کسی رپورٹ کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ ہمیں اس کا ردعمل غیرمکساں لگتا ہے۔ کیونکہ ہمیں ان باتوں کا پورا علم نہیں۔

پھر بھی مجھے اس رپورٹ کی تیاری میں پوری احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ دو تین افراد پہلے بھی اسی مسئلے کے بارے میں رپورٹیں داخل کر چکے ہیں۔ (ظاہر ہے، مجھے وہ رپورٹیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔) اگر ہماری رپورٹوں کے درمیان کوئی اختلاف پایا گیا تو جی ایم ضرور مزید تحقیقات کرے گا۔ پھر یہ افواہ بھی ہے کہ ایک دو لوگ اور بھی اسی مسئلے پر رپورٹ لکھنے والے ہیں۔ میری رپورٹ کا ان کی رپورٹوں سے موازنہ کیا جانا ناگزیر ہے۔

جس بات سے میں خاص طور پر ناخوش ہوں وہ یہ ہے کہ رپورٹ مکمل ہونے کے بعد میرے پاس اس کا ایک پرزہ بھی باقی نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ہمیں کسی رپورٹ کی نقل اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمیں اس کے ابتدائی نوٹس اور پہلے ڈرافٹ بھی بھجوانے پڑتے ہیں۔ آدمی اتنی محنت کر کے اتنی احتیاط کے ساتھ ایک رپورٹ تیار کرتا ہے، اور اس کی یادگار بھی نہیں رکھ سکتا۔

تمہیں خط لکھنے کی یہی وجہ ہے۔ شاید یہ ایک احمقانہ خیال ہے۔ بعض لوگ اسے صریح پاگل پن قرار دیں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اپنے منصوبے میں ناکام ہونے پر مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میں ہر چیز کے لیے تیار ہوں۔

میرا ارادہ یہ ہے کہ میں اس رپورٹ کی ایک کاپی خفیہ طور پر تمہیں بھیج دوں۔ کمپنی کے پاس میرے تمام رشتےداروں اور دوستوں کے بارے میں تفصیلات موجود ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی کو بھیجنا عقلمندی نہیں ہو گی۔ تمہارے پاس چھوڑنے میں خطرہ کم ہے۔ کیا تم اپنے پرانے اسکول کے ساتھی کے لیے اتنی زحمت گوارا کر لو گے؟

میں اپنا پتا نہیں لکھ رہا۔ میں نہیں چاہتا کہ کمپنی کو اس کی بو لگے۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرا پتا پنچوانی ایسوسی ایٹس کے ہاتھ لگ جائے۔ (ویسے ممکن ہے یہ ان کے پاس پہلے سے ہو۔) پنچوانی ایسوسی

ہیں۔ وہ ہماری تمام خط و کتابت کی نگرانی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے میں تمہیں چند روز میں دوبارہ خط لکھوں گا اور یہ بھی بتاؤں گا کہ تم کسی پتے پر مجھے خط لکھ سکتے ہو۔ فی الحال اتنا کافی ہے۔

تمہارا نکھل بوس

نکھل بوس... پہلے تو اس نام سے میں اچنبھے میں پڑ گیا۔ لیکن "پرانے اسکول کے ساتھی" کے لفاظ سے ایک گھنٹی سی بج اٹھی۔ بوس جمشیدپور کے ایلیمنٹری اسکول میں دو برس تک میرا ہم جماعت رہا تھا۔ درحقیقت میں اس کے زیادہ قریب نہ تھا -- اور اب تو میں اپنے قریبی دوستوں تک کو بھول چکا ہوں -- تو بوس مجھے کیسے فوراً یاد آ سکتا تھا؟ اپنی یادداشت پر بہت زور ڈالنے پر ہی مجھے ایک دبلے پتلے، عینک لگائے ہوئے لڑکے کا چہرہ دھندلا سا یاد آ سکا۔ وہ کلاس میں واحد لڑکا تھا جو عینک لگاتا تھا۔ اسی سے وہ میری یادداشت میں رہ گیا تھا۔

یہ خط ٹائپ کیا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ دستخط بھی ٹائپ شدہ تھے۔ میں نے ڈاک کی مہر پڑھنی چاہی لیکن وہ بہت مدھم تھی۔ اس لیے میں نے اسے تین یا چار بار پڑھا اور پھر میز کی دراز میں رکھ دیا۔

کوئی دو ہفتے بعد مجھے ایک اور خط ملا۔ اس میں لکھا تھا:

۲۸ اکتوبر

ڈیر بابی پیلانکر...

پچھلے چار دن سے میں تمہیں خط لکھنے کے موقعے کی تلاش میں تھا۔ یہ صحیح وقت ہے۔ میرے پاس پینتیس منٹ ہیں۔

غالباً کچھ دنوں پہلے میں نے تمہیں ایک رپورٹ کے بارے میں لکھا تھا۔ درحقیقت میں کسی قسم کی رپورٹ نہیں لکھ رہا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو کچھ میں نے تمہیں لکھا تھا وہ درست نہیں تھا۔

شاید میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ میں جگہ جگہ سفر کرتا رہا ہوں۔ میری اس بات پر حیران نہ ہونا کہ میں نے پچھلے تین ماہ اسی کمرے میں گزارے ہیں۔ کبھی کبھی جب تم دن رات سفر میں ہو تو تمہیں خیال ہونے لگتا ہے کہ تم ایک مقام پر ٹھہرے ہوئے ہو۔ ویسے اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

یہ تو بات ہوئی ضابطے اور بےخبری کی۔

Scanned with CamScanner

دراصل میں جو چیز لکھنے میں مصروف ہوں وہ وضاحت طلبی کا ایک خط ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ میں بعض اہم معاملات کے بارے میں وضاحت طلب کروں۔ مجھے ملازمت کرتے ہوئے اتنے سال ہو گئے، لیکن اب تک مجھے ملازمت کی شرائط کا کچھ بھی علم نہیں۔

میں مندرجہ ذیل سوالات اٹھانا چاہتا ہوں؛

۱۔ براہ کرم وضاحت کیجیے کہ کون سے افسر عہدے میں مجھ سے اوپر اور کون سے مجھ سے نیچے ہیں۔ مجھے شبہ ہے کہ بعض افسر جو مجھے احکامات دیتے ہیں، مجھ سے عہدے میں کمتر ہیں۔ میں ان کے احکامات کو نظرانداز کر دیتا ہوں۔ بعض اوقات ایسے افسر جنھیں میں احکامات جاری کرتا ہوں، وہ میرے احکامات کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ غالباً وہ عہدے میں مجھ سے اوپر ہوں گے۔ پھر بھی یہ ناممکن نہیں ہے کہ میں جن کے احکامات کو نظرانداز کرتا ہوں وہ عہدے میں مجھ سے اوپر ہوں۔ اور وہ جو میرے احکامات کو نظرانداز کرتے ہیں مجھ سے نیچے ہوں۔ تو کس کو کس کے احکامات کی تعمیل کرنی چاہیے؟

۲۔ مندرجہ بالا سیاق و سباق میں ایک اور سوال کیا ایسے افسر بھی ہیں جو عہدے میں میرے برابر ہوں؟ اگر ایسا ہے تو وہ تعداد میں کتنے ہیں؟ ان سے کیا برتاؤ کرنا چاہیے اور کس رویے کی ان سے توقع کرنی چاہیے؟

۳۔ ہمیں ایک سرکلر موصول ہوا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو اس کی تنخواہ اس کی ریٹائرمنٹ کے وقت یکمشت ملے گی۔ اگر کوئی شخص اس سے پہلے ملازمت سے استعفا دینا چاہے تو کیا ہو گا؟ کیا اسے کوئی رقم ملے گی؟ کتنی؟

۴۔ اگر میں اپنی میز کا رخ جنوب کی طرف کر لوں تو کیا اس پر کوئی اعتراض ہے؟

۵۔ کیا سرخ روشنائی استعمال کی جا سکتی ہے؟

۶۔ کیا ہر کاغذ پر واٹرمارک کی پڑتال کرنا ضروری ہے؟

۷۔ درخواست گزاروں کو قطار میں کتنی دیر تک انتظار کرانا ضروری ہے؟

مجھے یقین ہے میرے ذہن میں چند اور سوالات بھی ہیں۔ ابھی انھوں نے واضح شکل اختیار نہیں کی، اس لیے میں انھیں کاغذ پر نہیں اتار سکتا۔ لیکن میں اوپر لکھے ہوئے نکات کے بارے میں تمھاری رائے ضرور دریافت

کرنا چاہوں گا۔

ایک اور اہم معاملہ؛ میں وضاحت طلب کرنے کے منصوبے بناتا رہا ہوں لیکن مجھے ذرا بھی اندازہ نہیں کہ اس کام کےلیے کون سا موسم مناسب ہے۔ میرا خیال ہے کہ موں سوں کا موسم ٹھیک رہے گا۔ عمارتیں سلیٹی اور گیلی ہوتی ہیں اور چھتریاں گلیوں میں تیرتی پھرتی ہیں۔ اور کھڑکی پر کوّا بیٹھا ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جاڑوں کا موسم دراصل بہترین ہے۔ خرابی یہ ہے کہ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ اس وقت کون سا موسم چل رہا ہے۔ میں نے خط کے اوپر ۲۸ اکتوبر لکھا ہے، لیکن اس کا کوئی خاص مطلب نہیں۔ جب میں اپنی چھوٹی سی کھڑکی سے باہر دیکھتا ہوں تو مجھے آسمان پر کوئی بادل دکھائی نہیں دیتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ آج کل بہت گرمی ہے۔ دوسری طرف کوئی خاص سردی بھی نہیں ہے۔ تو کیا یہ گرمیوں کا موسم ہے؟ گرمیوں کا آغاز؟ یا اختتام؟ تین دن پہلے شام کے وقت سرد ہوا چلی تھی۔ ہاں، میں نے سویٹر مانگا تھا۔ اسے پہن کر مجھے بہتر محسوس ہوا۔ لیکن جب رات میں میری آنکھ کھلی تو پسینے میں شرابور تھا۔ سخت گرمی لگ رہی تھی۔ میں نے سویٹر اتار پھینکا۔ مجھے اس کی دوبارہ ضرورت نہیں پڑی۔ لیکن کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ یہ سردیاں نہیں ہیں؟ بعض اوقات جاڑوں کے موسم میں بالکل سردی نہیں پڑتی۔

اگر یہ سردی کے بغیر جاڑوں کا موسم ہو سکتا ہے، تو کیا موں سوں نہیں ہو سکتا؟ بارش کے بغیر موں سوں؟

شاید بالکل بارش کے بغیر بھی نہیں۔ کل صبح سویرے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو چوک گیلا نظر آیا تھا۔ میں نے دیواروں کی طرف دیکھا۔ لیکن دیواریں پانی کو جذب کر لیتی ہیں اس لیے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ شاید صبح سویرے انھوں نے چوک کی دھلائی کی ہو۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ آج کل انھوں نے دھلائی وغیرہ کو تقریباً خیرباد ہی کہہ دیا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے دھلائی دوبارہ شروع کر دی ہو۔ یا ممکن ہے کہ اب وہ دھلائی کبھی کبھار ہی کرنے لگے ہوں۔ اس لیے میں یہ طے نہ کر سکا کہ کل صبح بارش ہوئی تھی یا چوک کو دھویا گیا تھا۔

اب میرا غم نہیں موسم غلط

اگر تم ان الجھنوں سے نکلنے میں میری مدد کر سکو تو بہت اچھا ہو۔ تم بمبئی میں رہتے ہو، اس لیے تمھیں ان چیزوں کے بارے میں اچھا خاصا علم ہو گا۔ جب تک تمھارا جواب آئے گا تو وہ خط جو میں بھیجنے والا ہوں، میرے ذہن میں زیادہ قطعی شکل اختیار کر چکا ہو گا۔

Scanned with CamScanner

یہ کہنا غیرضروری ہے کہ میں اس بار بھی اپنا پتا نہیں لکھ سکتا۔ اس کی وجہ میں پچھلے خط میں بتا چکا ہوں۔ ہر بار نئے بہانے تراشنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔

تو میں چند روز میں تمہیں اطلاع دے دوں گا کہ تم کس طرح مجھ سے رابطہ قائم کر سکتے ہو۔ امکانات اچھے ہیں۔ موسم غلط

خط اس مقام پر آ کر ختم ہو گیا تھا، جیسے اسے نامکمل چھوڑ دیا گیا ہو۔ اس پر کوئی دستخط نہ تھے۔ اسے ایک نیلے نوٹ پیپر پر جلی اور خم دار خط میں لکھا گیا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا، لیکن مجھے احساس ہوا کہ جیسے لکھنے والے نے جان بوجھ کر معمول سے مختلف خط میں لکھنے کی کوشش کی ہو۔

اس خط پر مہر پڑھی جا سکتی تھی۔ شہر کا نام لگتا تھا وہی ہے جہاں سے پہلا خط پوسٹ کیا گیا ہو گا۔

میں نے اس خط کو بھی تین چار بار پڑھا، پھر رکھ دیا۔ چند روز بعد مجھے ایک اور خط ملا۔

ڈیر بابی پیلانکر...

میں استعفا دینے کی تیاری کر رہا ہوں۔ بہت ہو چکا۔ ملازمت کے پہلے روز سے میں اپنے ذہن میں جس چیز کو ترتیب دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں وہ -- میں جانتا ہوں -- کچھ اور نہیں، یہی استعفے کا خط ہے۔

کیا استعفا دینے کے بعد میں آ کر تمہارے ساتھ رہ سکتا ہوں؟ میرا خیال ہے ہم دونوں کی اچھی نبھے گی۔ اس بارے میں غور کرنا۔ تمہیں پھر لکھوں گا۔

م۔ ل۔ ب۔

اس خط پر کوئی تاریخ نہیں تھی۔ اس بار لکھائی بھی مختلف تھی؛ حروف گول تھے اور ان کے درمیان کافی فاصلہ تھا، اس طرح کہ ہر حرف ایک جزیرہ معلوم ہوتا تھا۔

میں خط پر غور کرنے لگا۔ بلکہ مجھے غصہ آنے لگا۔ اسے آ کر میرے ساتھ رہنے کا کیا حق ہے؟ یہ ناانصافی ہے، اگر کچھ اور نہ بھی کہا جائے تو۔ کیا آپ کسی کے ساتھ بھی جا کر رہنا شروع کر دیں گے، صرف اس لیے کہ اس کا پتا آپ کے ہاتھ لگ گیا ہے؟ اسے میرے بارے میں کیا معلوم ہے؟ کیا وہ جانتا ہے کہ میں کہیں ملازم ہوں یا نہیں؟ شادی شدہ ہوں یا نہیں؟ میرے کتنے بچے ہیں؟ کتنی بیٹیاں؟ ان کی عمریں؟ میرا گھر کس طرح کا ہے؟ اس میں کتنے کمرے ہیں؟ کیا میرا باپ زندہ ہے؟ اور میری ماں؟ میرے مالی حالات کیسے ہیں؟

خطوں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن ایک گوشت پوست کا آدمی؟ میں نے خود کو ٹوکا۔ اگر وہ واقعی آ کر میرے ساتھ رہنے لگے تو؟ میں نے خود سے پوچھا۔ میں اس کمرے میں پچھلے تین برس سے اکیلا رہ رہا ہوں۔ اس کمرے میں کوئی نہیں سویا، سوائے میرے۔ میں بالکل ننگا ہو کر سوتا ہوں۔ اگر یہاں کوئی اور بھی ہوا تو یہ کیسے ہو سکے گا؟ میرے جسم پر کوئی بھی لباس ہو تو مجھے نیند ہی نہیں آتی۔ جس کا مطلب ہے مجھے راتوں کو جاگتے رہنا پڑے گا۔

میں فکر میں مبتلا رہا۔ دو دن کے اندر مجھے ایک اور خط ملا۔

ڈیر بابی۔۔۔

جب مجھے یہ ملازمت ملی تھی تو مجھے کچھ خیال تھا کہ استعفےکے بارے میں سوچنا بھی حماقت ہے۔ پھر میں استعفا دینے کے بارے میں کیوں سوچتا رہا؟ شاید خود کو حوصلہ دیتے رہنے کے لیے۔ لیکن کیا میں واقعی استعفا دینے کا سوچ رہا تھا؟ میں کیا چاہتا تھا؟ یہ الفاظ میرے ذہن میں کیا کر رہے تھے؟

لیکن اب مجھے کم و بیش یقین ہو گیا ہے کہ دراصل جو کچھ میں لکھنا چاہتا تھا وہ بالکل مختلف چیز تھی۔ درحقیقت میں فردِ جرم کے ایک خط کو واضح شکل دینے کی کوشش میں تھا جس سے ہر چیز درست تناظر میں آ جائے۔

ان معاملات میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک ایک لفظ کو تولنا پڑتا ہے۔ حقائق کی بار بار جانچ پڑتال کرنی پڑتی ہے۔ میرا خیال ہے اب مجھ میں وہ پختگی آ گئی ہے جو اس کام کو سرانجام دینے کے لیے درکار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس کا مصمّم ارادہ کر لیا ہے۔

پچھلے چند مہینوں سے میں کمپنی کے معاملات، اور خصوصاً جی ایم کے رویّے کا بغور مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ حال ہی میں پنجوانی ایسوسی ایٹس کو ہمارے کچھ صنعتی راز ہاتھ لگ گئے۔ بلکہ انھوں نے پیداوار بھی شروع کر دی ہے۔ مجھے روز بہ روز یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اور شخص نہیں بلکہ جی ایم خود ہے۔ میں نے کچھ اور چیزیں بھی نوٹ کی ہیں۔

اس لیے اب میں ایک طویل خط، تمام دستاویزی شہادتوں کے ساتھ، براہِ راست بورڈ آف ڈائرکٹرز کو لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

اس میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ میرےلیے یہ خط خود بھیجنا خطرے سے خالی نہیں ہو گا۔ لہٰذا میں یہ خط تمہیں بھیجوں گا۔ تمہیں اس کو ٹائپ کر کے پوسٹ کرنا اور اصل کو جلا دینا ہو گا۔

میں کچھ اور باتوں کے بارے میں بھی لکھنا چاہتا تھا، لیکن وقت بہت

Scanned with CamScanner

تمہارا سچی آنند

دستخط کے سوا پورے خط کو ٹائپ کیا گیا تھا۔

عجیب سی بات ہے کہ اب مجھے اس بات پر اداسی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ آ کر میرے ساتھ کیوں نہیں رہتا! میں خود ریلوے اسٹیشن جا کر اس کا استقبال کرتا۔ میں اس کا سوٹ کیس اٹھا کر لاتا۔ میں اس کا کوٹ اپنے کمرے کے اکلوتے ہینگر پر لٹکا دیتا۔ اگر وہ ٹوتھ برش ساتھ لانا بھول جاتا تو میں بھاگ کر نیچے جاتا اور اس کیلیے ٹوتھ برش لے آتا۔ میں اسے فلم دکھانے لے جاتا۔ میں اس سے سوالات کرتے، اس سے تبادلۂ خیال کرنے کے لیے اتنا بیتاب تھا!

ڈھائی مہینے تک مجھے اس کا کوئی خط نہ ملا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس کو بھول جانا چاہیے۔ تب ایک دن، مجھے ایک خط ملا!

۲ فروری ۱۹۶۷

ڈیر بابی پیلانکر---

تمام معاملات درست ہوتے جا رہے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ مجھے فردجرم کا خط لکھنے کا خیال کیسے آیا تھا۔ فردجرم!

میں تو اپنے خیال میں فردجرم لکھنے بیٹھا تھا، مگر جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں تو معافی کی درخواست لکھ رہا ہوں۔

ہاں، میں نے معافی کی درخواست کی۔

ہاں، میں نے معافی کی درخواست کی۔ پنسل تراشتے وقت نظر اٹھانے کے لیے، تیسرے موڑ پر مڑ کر پیچھے دیکھنے کے لیے، صبح منہ دھونے سے پہلے "ڈسکوری آف انڈیا" پڑھنے کے لیے، کھڑکی کے چمچے پر ایک سیب سڑنے کو چھوڑ دینے کے لیے، تازہ اخبار کو سونگھنے کے لیے، کھمبے کو نہ چھونے کے لیے، سبز گلاس میں پینے کے لیے، دیوی داس بخشی کا نام لینے کے لیے، ناخن چھپانے کے لیے، نرسری رائمز لکھنے کی خواہش کرنے کے لیے، لکھے ہوئے لفظ کو مٹانے کے لیے، آئینے پر سانس لینے کے لیے۔

تمہیں خط لکھنے کے لیے۔

یہ آخری خط ہے۔

جہاں تک میرا سوال ہے، میں نے تمہیں کبھی بغیر وجہ کے خط نہیں لکھا۔

یہ خط تمہیں یہ بتانے کے لیے لکھ رہا ہوں! میرے تمام خط جلا دینا۔

اس خط سمیت۔ میں پہلے ہی بہت کچھ سہہ چکا ہوں۔

(دستخط)

خط پر دستخط انگریزی میں تھے، لیکن پڑھے نہ جاتے تھے۔ پہلے نام کا پہلا حروف سی یا جی تھا، اور آخری نام بھی سی یا جی سے شروع ہوتا تھا۔

اب مجھے اس کو واقعی بھول جانا چاہیے، میں نے خود سے کہا۔ میں خود کو اس کے خط پھاڑ دینے پر آمادہ نہ کر سکا۔ میں نے انہیں میز کی دراز کی تہہ میں رکھ دیا۔

پھر میں کاغذ کے لفافے بنانے کا کام کرنے لگا اور خطوں کے بارے میں سب کچھ بھول گیا۔

ایک مہینے بعد مجھے ایک خط ملا!

بابی---

میں نے لکھنا شروع کیا۔ کوئی بات نہیں بن رہی تھی، اس لیے میں نے کاغذوں کو پھاڑ دیا۔ پھر لکھنے بیٹھا۔ پھر کاغذوں کو پھاڑ دیا۔ کئی دن تک سوچ سوچ کر پریشان ہونے کے بعد اب پھر لکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے بارے میں سب کچھ۔ شاید اپنے لیے۔

میرے ساتھ جو ہونے والا ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر میں ذرا بھی فکرمند نہیں۔ ابھی پچھلے ہی روز مجھے معلوم ہوا کہ ہمارا بورڈ آف ڈائریکٹرز زیادہ تر پنجوانی سنڈیکیٹ کے افراد پر مشتمل ہے۔ اب مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تم سے آخری درخواست کرنا چاہتا ہوں۔ جو تحریر میں اپنے بارے میں لکھ رہا ہوں، وہ میں نہیں چاہتا کہ ہماری کمپنی/ پنجوانی سنڈیکیٹ کے ہاتھ لگے۔ کیا تم یہاں آ کر اسے لے جا سکتے ہو؟ میں اسے ڈاک سے نہیں بھیج سکتا۔ تین دن بعد مندرجہ ذیل پتے پر آ جانا۔ اس وقت تک میں اسے مکمل کر چکا ہوں گا۔

پتا یہ ہے:

"سپھلیہ"

ڈاکٹر امبیدکر روڈ

سیتاپور

میرے کمرے میں دراز کے اندر تمہیں ایک نوٹ بک ملے گی، جس کے سرورق پر نہرو کی تصویر ہے۔ کاغذ بغیر لکیروں کے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو تمہیں ساتھ لے جانی ہے۔

یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ جب تم یہاں آؤ گے تو میں غالباً یہاں نہیں ہوں گا۔

Scanned with CamScanner

تھا۔ لکھائی بہت ٹوٹی پھوٹی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہر لفظ کا ہر حرف بہت آہستہ آہستہ، بڑی دقت سے لکھا گیا ہو۔

میں الجھن میں مبتلا ہو گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا مجھے سیتاپور جانا چاہیے؟ ایک طرف تو میں جانے کو بیتاب تھا۔ دوسری طرف مجھے یہ خیال بھی تھا کہ کہیں یہ محض حماقت تو نہ ہو گی۔ کیا میں واقعی اس کے خط پر یقین کر سکتا ہوں؟ شاید یہ سفر بےثمر ثابت ہو۔ میں جنگلی بطخ کے تعاقب پر پیسے برباد نہیں کر سکتا۔ یہ درست ہے کہ میں نے کاغذ کی لذائی بنا بنا کر کچھ رقم اکٹھی کر لی تھی۔

دو روز تک میں اس الجھن میں گرفتار رہا۔ تیسرے روز صبح اٹھا، نہایا دھویا اور سوٹ کیس میں کچھ چیزیں ٹھونس کر ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گیا۔

میں سیتاپور کے اسٹیشن پر اترا اور شہر میں داخل ہو گیا۔ مجھے یہ ایک غلیظ شہر معلوم ہوا۔ سڑکیں کولتار کی تھیں لیکن بہت تنگ اور گردآلود۔ دن بھر کے سفر سے میرا جسم اینٹھ رہا تھا۔ میری آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ شام ہونے لگی تھی لیکن ہوا اب تک گرم اور خشک تھی۔

امبیدکر روڈ تک پہنچنے میں خاصی دیر لگی۔ کوئی شخص درست راستا ہی نہ بتاتا تھا۔ لوگ کاہل اور بیہودا تھے۔ وہ مکانوں کی سیڑھیوں پر یا صحن میں چارپائیوں پر کاہلی سے اونگھ رہے تھے۔

جب میں امبیدکر روڈ پہنچا تو دن کی روشنی مکانوں کی چھتوں کے پیچھے غائب ہو رہی تھی۔ گلی کے نکڑ پر ایک ہوٹل تھا، اور کچھ اور آگے چل کر کریانے کی دکان۔ بائیں ہاتھ پر دھوئیں کی لکیر فضا میں بلند ہو رہی تھی۔ دائیں ہاتھ پر ایک پھاٹک کے باہر میں نے تختی دیکھی: "سپھلیہ"۔ مکان خاصا پرانا معلوم ہوتا تھا، لیکن اس پر حال ہی میں رنگ کیا گیا تھا۔ میں پھاٹک میں داخل ہو گیا۔

میں نے احاطے کے اندر جا کر چند لمحے انتظار کیا۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ پھر ایک بوڑھا آدمی باہر آیا۔

"کیا یہاں کوئی بوس نام کا شخص رہتا ہے؟"

"تم کون ہو؟"

"ایک دوست، پیلانکر۔"

بوڑھے نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اس نے مجھے ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور اندر چلا گیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چابیوں کا گچھا لیے برآمد ہوا، اور مجھے اپنے پیچھے عقب کی سیڑھیوں سے اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

بوڑھے کی آواز چوبی سیڑھیوں کی چرچراہٹ میں سے چھن کر آنے لگی: "ہسپتال والے صبح لاش لے گئے۔ اس نے لاش ہسپتال کو دینے کو کہا تھا۔"

بوڑھے نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ میں نے اندر قدم رکھا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ ایک پلنگ، ایک میز، کتابیں، میز پر ایک لیمپ، ایک ایش ٹرے، سگریٹ کے دو ڈبے، دیوار پر دو کیلوں میں لٹکی ہوئی قمیصیں اور پتلونیں، کونے میں رکھا ہوا ایک بڑا سا صندوق۔

اس منظر سے اپنے مایوس ہونے سے میں محظوظ ہوا۔ گویا میں یہاں کوئی عجیب و غریب چیز دیکھنے کی توقع کر رہا تھا!

بوڑھا میرے پاس خاموشی سے کھڑا رہا۔ میں آگے بڑھا۔ دراز کھولی۔ کاغذ، نوٹ بکس، قلم اور پنسلیں، کچھ ریزگاری۔ میں نے نوٹ بکس کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور نہرو کی تصویر والی نکال لی۔ اسے میں نے اپنے سوٹ کیس میں رکھ لیا۔ سوٹ کیس کو تالا لگایا۔ بوڑھے کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر میرے لیے راستا چھوڑ دیا۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ بوڑھا کمرے کو تالا لگانے لگا اور میں سیڑھیاں اترنے لگا۔

راستے میں میں نے نوٹ بک کو باہر نہیں نکالا۔ میں نے اسے گھر پہنچ کر کھولا۔

نوٹ بک بالکل سادہ تھی۔ آخری صفحے پر بھدّے سے خط میں لکھا تھا: "تکھل"۔

میں نے ایک بار پھر نوٹ بک کا ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا۔ کیا اس نے اسی نوٹ بک کے بارے میں لکھا تھا؟ سرورق پر نہرو کی تصویر تو تھی! لیکن کیا کوئی مجھ سے پہلے بھی کمرے میں داخل ہوا تھا اور اس نے -- یا انھوں نے -- اصل نوٹ بک اپنے قبضے میں کر لی تھی؟ کیا وہ بوڑھا قابلِ اعتبار تھا؟ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے پہلے بھی کسی نے وہ دراز الٹ پلٹ کر دیکھی تھی۔ یا کم از کم اب مجھے یہی لگ رہا تھا کہ اس وقت میں نے یہ محسوس کیا تھا۔ شاید مجھے مغالطہ ہوا ہو۔ یا شاید کسی نے واقعی دراز میں کچھ تلاش کیا ہو؛ ممکن ہے وہ بوڑھا ہی ہو، پیسوں کی تلاش میں۔

میں دوبارہ آخری صفحہ پلٹتا۔ کیا یہ اسی کی لکھائی تھی؟ مجھے اس تک کا یقین نہیں تھا! اس کے پہلے خط میں ٹائپ شدہ دستخط تھے۔ اس کے بعد کے خطوط مختلف ناموں سے، مختلف لکھائیوں میں تھے۔ کیا میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ تمام خط اسی نے لکھے تھے، ایک ہی شخص نے لکھے تھے؟ اگر میں یہ تمام خط کسی کو دکھاؤں، اور وہ کہے کہ "یہ سب خط تم نے خود لکھے ہیں"، تو میں اسے کس طرح غلط ثابت کروں گا؟

نوٹ بک اب بھی میرے پاس ہے۔ مستقل الٹے جاتے رہنے سے اس کے صفحوں کے کونے مڑ گئے ہیں۔

(مراٹھی)

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

OOOOO

صبح جب اٹھو تو اپنی ہتھیلی کو غور سے دیکھو۔ یہ سنسکرت کی ایک مشہور کہاوت ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ آج کل کے نوجوان شاید اس سے مانوس نہ ہوں۔ وہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم ہتھیلی میں کیا دیکھ سکتے ہو؟ اس قسم کے سوالات کا جواب دینا بےسود ہے۔ جن کے بازوؤں میں کوئی دم خم ہی نہ ہو، وہ اپنی ہتھیلیوں میں کیا دیکھ سکیں گے؟

معمول کے مطابق میں پانچ بجے اٹھا۔ میں نے اپنی سیدھی ہتھیلی کا معائنہ کیا۔ میری جیون ریکھا واقعی بہت پکی ہے، میں نے آپ سے کہا، دیا ہے بھگوان کی۔

میں بستر سے اٹھا اور دیوار پر ٹنگے کیلنڈر کے پاس آیا۔ نکڑ والی لانڈری اپنے گاہکوں کو ہر سال کرسمس سے پہلے کیلنڈر دیتی ہے۔ اصل میں میں اپنے کپڑے گھر ہی پر دھوتا ہوں مگر ہر سال کرسمس سے چند دن پہلے اپنی دو اونی جیکٹیں لانڈری لے جاتا ہوں اور انہیں واپس وصول کرتے وقت نہایت تاکید کے ساتھ کیلنڈر مانگنا نہیں بھولتا۔ مجھے یہ مخصوص کیلنڈر پسند ہے، کیوں کہ یہ ہر تاریخ کو ایک الگ پرچی پر دکھاتا ہے۔ ہر روز آپ ایک تاریخ پھاڑ دیں۔ ایسے کیلنڈر اب مقبول نہیں رہے مگر مجھے اس قسم کے کیلنڈر ان سے زیادہ پسند ہیں جو اب عام ہو گئے ہیں۔ ایک تاریخ روزانہ پھاڑنا اپنےآپ کو یاد دلانے کا نہایت عمدہ طریقہ ہے کہ وقت گذر رہا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے کہ آپ بھگوان کو ہر اس دن کی رسید دے رہے ہیں جو آپ کو عطا ہوا ہے۔ میں اس طرح سے رسید فوراً دینا پسند کرتا ہوں، بجائے اس کے کہ مہینے کے آخر پر یا دو تین ماہ کے بعد دوں۔ جنوری میں پرچیوں کا جو انبار نظر آتا ہے، وہ دھیرے دھیرے گھٹنے لگتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں نے سوچا، تھوڑا تھوڑا کر کے آپ اس ناسوردار گرہ کو کاٹتے ہیں اور پھر یہ ہر سال ازسرنو نمودار ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے اوٹ پٹانگ خیال آج کل میرے دماغ میں بہت آتے ہیں۔

میں کیلنڈر کے پاس گیا اور تاریخ پھاڑ ڈالی۔ پھٹی ہوئی پرچی اپنی مٹھی میں دبائے میں نئی تاریخ کو تکنے لگا۔

گیارہ جون۔ آج میں ستّر برس کا ہو گیا، میں نے اپنے آپ سے کہا۔

میں دروازے تک گیا کہ کاغذ کی یہ گولی پھینک دوں، مگر بھول گیا اور دروازے کی دہلیز پر کھڑا خیالات کی رَو کا پیچھا کرتا رہا۔ مجھے یاد آیا کہ میرے بچپن میں میری سالگرہ پر چھٹی ہوا کرتی تھی، کیوں کہ اس روز بادشاہ جارج پنجم کی بھی سالگرہ ہوتی تھی۔ وہ اب تخت نشین نہیں ہے، اس کے ورثا یہ ملک چھوڑ گئے ہیں، اور اب میں چھٹی کے دن والی سالگرہ پر بچوں جیسی خوشی محسوس نہیں کر سکتا۔ ایک اور خیال جو مجھے آیا وہ یہ تھا کہ انجیل کے مطابق انسانی زندگی کا دورانیہ ستّر برس ہے، جبکہ ہمارا ہندوستانی عقیدہ کہتا ہے کہ سو برس ہے۔ میں ستر تک تو پہنچ گیا بھگوان کی دیا سے، اب اگر میں سو برس تک جیوں تو مزید

تیس برس کس طرح گذاروں گا؟

اس مقام پر مجھے خیال آیا کہ میں کاغذ کی گولی کو مٹھی میں دبائے جا رہا ہوں۔ میں نے اسے باہر اچھال دیا اور چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ بہت سارے بےربط سوال میرے ذہن میں ابھرے۔ اس چوکھٹ کو میرے ستّر برس کا ہوجانے سے کیا تعلق؟ میرا ان لوگوں سے کیا رشتہ ہے جو آج سے ستر برس پہلے پیدا ہوئے اور اب زندہ نہیں ہیں؟ اس کا کیا ثبوت ہے، کاغذ کے چند پرزوں کے سوا، کہ میں ستّر برس جیا ہوں؟ کیا میں اپنی سالگرہ کے لیے چپّلوں کی نئی جوڑی خرید لوں؟ یا میرے لیے چمکدار کف لنکس بہتر رہیں گے؟

میں نے فیصلہ کیا کہ ان سوالوں کے حل ڈھونڈنے میں بہت وقت لگ جائے گا، اس لیے چوکھٹ سے ہٹ آیا اور اپنے روزمرّہ کے معمولات میں مصروف ہو گیا۔ ایک بات کا فیصلہ میں نے کر لیا تھا، میں اس دن کو اور دنوں کی طرح گذارنا چاہتا تھا، سوائے ایک فرق کے۔ میں روزانہ کے مقابلے میں آج سوچ بچار پر زیادہ وقت لگانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

پاخانے کے فلش پر اکڑوں بیٹھے ہوئے میں نے خود کو انھی سوالوں میں الجھے ہوئے پایا، جو میرے ذہن پر بلاّ بولے ہوئے تھے۔ فارغ ہونے کے بعد میرا معمول ہے کہ میں پاخانے پر غور کرتا ہوں؛ حالانکہ ظاہر ہے کہ اکڑوں بیٹھے بیٹھے ایسا کرنا کسی قدر مشکل ہے، اور پھر آدمی یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ اس مشق سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ کیا آپ کو یہ توقع ہے کہ آپ چٹان یا پتھروں سے سبکدوش ہوئے ہوں گے؟ انجام کار آپ اس کے رنگ اور سختی میں آنے والی ذرا ذرا سی تبدیلیاں ہی دیکھ پاتے ہیں۔ بعض دفعہ چھوٹے چھوٹے چُنچُنے ہوتے ہیں، یا اگر بواسیر سے خون بہا ہے تو چمکدار سرخ جُھنڈیاں سی ہوتی ہیں۔ بےفائدہ ہی سہی، میری یہ عادت برقرار ہے۔ مگر اس موقعے پر میرا دماغ ان سوالوں میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ، اس سے پہلے کہ مجھے نیچے جھانکنے کا خیال آتا، پاخانہ گٹر میں بہہ گیا۔ اس سے فرق تو کوئی زیادہ نہیں پڑتا۔ پھر بھی میں کچھ بےچین سا ہو گیا۔

صبح سویرے کی چہل قدمی پر روانہ ہونے سے قبل میں نے امرود کی ایک پھانک طوطے کے پنجرے میں ڈال دی۔ مجھے گھر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھ کر طوطا حسبِ معمول چلاّنے لگا، "تاریخ ہمارے ساتھ ہے۔" یہ وہ واحد فقرہ ہے جو طوطا ادا کر سکتا ہے۔ جب بھی میں باہر جاتا ہوں یا واپس آتا ہوں، یا جب کوئی ملنے آتا ہے یا واپس جاتا ہے، تو وہ چیخ چیخ کر یہی پیغام دیتا ہے۔ ان پُراعتماد الفاظ کی گونج کانوں میں لیے ہوئے میں نے باہر قدم رکھا۔

صبح کی ہوا فرحت بخش تھی۔ راتیں حد سے زیادہ گرم ہونے لگی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ آسمان میں اکادکا بادل ہیں۔ موں سوں ہم پر برسنے ہی والا تھا۔ میں برسات کا ایک موسم اور دیکھ لوں گا، میں نے اپنےآپ سے کہا۔ حالیہ برسوں میں میں نے موں سوں کے چھینٹے اپنی کھڑکی کی عمودی سلاخوں کے پیچھے سے دیکھے ہیں۔

معمول کے مطابق میں مہاتما گاندھی باغ میں گیا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔

سورج نکل رہا تھا، چھوٹی چھوٹی چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

Scanned with CamScanner

گھر کے پاس آتے ہوئے میں نے دیکھا کہ سڑک بنانے والے آ گئے ہیں اور ان کے ساتھ آسفلٹ کے پیپے، بجری کی ڈھیریاں، اسٹیم رولر اور کام کا دوسرا ٹیم ٹماق ہے۔ انھوں نے سڑک کے بیچ میں ایک بورڈ لگا دیا تھا، راستا بند، سڑک زیرتعمیر۔

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ بلدیہ تلی بیٹھی ہے کہ برسات کی آمد سے پہلے سڑکوں کی مرمت کر دے۔ پھر ٹریفک آرام سے چلے گا، گاڑیوں کے ڈرائیور بلدیہ کو گالیاں نہیں دیں گے، اور پیدل چلنے والے گاڑی والوں کو گالیاں نہیں دیں گے کہ ان پر کیچڑ کا چھڑکاؤ کر دیا، اور ثابوت اٹھانے والے مُردوں کو نہیں کوسیں گے۔ میں اپنے مکان میں آ گیا۔

ساڑھے نو بجے میں نے دروازے پر دستک سنی۔ میں قدرے حیران ہوا کیونکہ میں کسی کے آنے کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ (بلکہ بات یہ ہے کہ میں کبھی کبھار ہی کسی کے آنے کی توقع کرتا تھا۔) میں نے دروازہ کھولا۔ کوئی آدمی تھا، پچاس کے لگ بھگ کا، اور اس کا چہرہ مانوس لگ رہا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا، وہ سدانند گوکرے تھا۔ خاصی حیرت ہوئی۔ میں نے سدانند کو کوئی بیس برس سے نہیں دیکھا ہو گا۔ وہ دبلاپتلا ہوا کرتا تھا مگر اب موٹاتازہ نظر آ رہا تھا۔

اُس وقت میں پچاس کے پیٹے میں تھا۔ سدانند تاریخ میں ایم اے کرنے والے میرے معدودے چند شاگردوں میں سے تھا۔ جس قصباتی کالج میں میں پڑھاتا تھا، کم ہی طالب علم اس درجے تک پہنچتے کہ گریجویٹ ڈگری کے لیے کسی ایک مضمون کی تخصیص کریں، اور ان میں سے بھی بہت ہی کم تاریخ میں ایم اے کرتے۔ سدانند ذہین آدمی نکلا۔ ہم گھنٹوں باتیں کیا کرتے اور اس نے کئی موقعوں پر میری تحقیق میں مدد دی۔ وہ اکثر کہا کرتا کہ وہ چاہتا ہے کہ کنوارا رہے اور میری مثال سامنے رکھتے ہوئے اپنے آپ کو تحقیق کے لیے وقف کر دے۔ میں نے اسے خبردار کیا کہ یہ بہت کٹھن اور خشک زندگی ہے۔ پھر اس نے گریجویشن کر لیا اور کسی دوسرے شہر میں اسکول ماسٹر ہو کر چلا گیا۔ بچھڑتے وقت ہم دونوں کو افسوس ہوا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد مجھے اس کی جانب سے شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا، اور پھر ایک خط۔ میں نے جواب نہیں دیا۔ دو یا تین سال کے بعد کسی نے مجھے بتایا کہ سدانند کی بیوی پہلی زچگی کے دوران مر گئی۔ پھر کئی سال تک مجھے اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی، اور اب وہ اپنا سامان اٹھائے میرے سامنے کھڑا تھا۔

سدانند نے اپنے تھیلے نیچے ٹکائے اور پیشانی سے پسینا پونچھا۔ وہ اس کرسی پر بیٹھ گیا جس کی جانب میں نے اشارہ کیا۔ "تاریخ ہمارے ساتھ ہے" طوطا چلایا۔ سدانند چونک پڑا۔

سدانند مجھے گھورنے لگا۔ میں نے اس کو غور سے دیکھا۔ بیس سال پہلے اس کا چہرہ کچھ نوعمر اور نازک لگتا تھا۔ اب پچاس کے پیٹے میں آ کر اس کا چہرہ جھریاں گیا تھا۔ پھر بھی اس میں شباب کا شبنمی اشارہ تھا، یا مجھے ایسا لگا۔ اس نے کہا، "میں اتنے عرصے سے اسکول میں پڑھاتا رہا ہوں۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ مگر وہ سب تحقیق نہیں کر سکا جو میں کرنا چاہتا تھا۔ اور میں آپ سے ملنا چاہتا تھا یا کم از کم آپ کو خط لکھتے رہنا، مگر یہ بھی نہ کر سکا۔ مجھے بہت اشتیاق تھا کہ کوروکشیتر کی جنگ پر آپ کا مقالہ دیکھوں۔ جب

وہ چھپا تو میں نے اسے بار بار پڑھا۔ اب میں نے بھی ایک تحقیقی کام کا آغاز کیا ہے۔ مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت ہے۔ آخر میں نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج آپ کی ستّرویں سالگرہ ہے اور مجھے خیال آیا کہ یہ آپ سے اتنے برسوں بعد ملنے کا اچھا موقع ہے۔ مبارک ہو!"

سدانند نے مٹھائی کا ڈبّا کھولا اور مجھے پیش کیا۔ اصولاً میں مقرّرہ اوقات کے علاوہ کھانے سے گریز کرتا ہوں۔ پھر یہ کہ مجھے مٹھاس سے پرہیز ہے۔ میں ایسی غذائیں پسند کرتا ہوں جن میں کڑوا یا تیکھا ذائقہ ہو۔ ان سے نظامِ جسم صفرا جیسی بیماریوں سے بچا رہتا ہے۔ مگر اس موقع پر میرا دل نہیں مانا کہ اس تحفے سے انکار کر دوں جو سدانند اتنی محبت سے پیش کر رہا تھا۔ اور جسے میں اتنے عرصے بعد دیکھ رہا تھا اس کو آزردہ نہ کرنے کے خیال سے میں نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اٹھا لیا۔

"کوروکشیتر کی جنگ پر آپ کی کتاب نے مجھے مسحور کر دیا۔" سدانند نے کہا۔ "تاریخ نویسی کا نقطۂ نظر بےحد گھساپٹا ہو گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے نیا میدان سر کیا ہے اور نئی تکنیک پیدا کی ہے۔"

کوروکشیتر کی جنگ پر میری کتاب کی کہانی یہ ہے: میں اس جنگ کا احوال لکھنے بیٹھا، مگر یہ حقیقت کہ مغلوں اور مراٹھا پیشواؤں کی جنگ صدیوں بعد اسی میدان پر لڑی گئی، میرے خیالات میں مداخلت کرتی رہی۔ بات اس وقت اور پیچیدہ ہو گئی جب مجھے احساس ہوا کہ بعض تفصیلات جن کا تعلق عرب اسرائیل جنگوں، بند پاکستان جنگوں اور ویت نام کی جنگ سے تھا، میرے ذہن میں کوروکشیتر کی لڑائی سے گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ میری کتاب بالآخر ان تمام جنگوں کی ایک غیرمعمولی کھچڑی بن گئی۔ میں نے اپنی جمع پونجی لگا کر یہ کتاب چھپوائی۔ مجھے معلوم تھا کہ مورّخین میرے طریقۂ کار کی معنویت نہیں دیکھ پائیں گے۔ میری توقع کے عین مطابق اس پر بہت کم تبصرے ہوئے، اور جو ہوئے بھی تو دشنام و ملامت کے زہر سے بھرپور۔

"مجھے جس چیز نے مسحور کیا وہ آپ کی مختلف جنگوں کو ٹیلی اسکوپ کرنے کی تکنیک ہے۔" سدانند نے کہا۔ "اس سے تاریخ نویسی کے میدان میں بالکل ہی نئے افق نظر آئیں گے۔"

"میں نے دراصل یہ چیز ایجاد نہیں کی جسے تم ٹیلی اسکوپ کرنے کی تکنیک کہہ رہے ہو۔" میں سمجھانے لگا۔ "یہ ازخود ہوگئی۔ میں اس بارے میں اپنی زیادہ وقعت کا دعوا نہیں کر سکتا۔"

"آپ انکسار سے کام لے رہے ہیں۔" سدانند نے بات جاری رکھی۔ "نام نہاد مورخین اس قدر مجرمانہ غفلت برت رہے ہیں۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔

سدانند بولا۔ "اب میں اپنے خیالات کی طرف آتا ہوں، وہ آپ کی معرکۃ الآرا بصیرت کے مقابلے میں خواہ کتنے ہی حقیر کیوں نہ ہوں۔ میرا تو یہ عقیدہ ہو گیا ہے کہ تاریخ نویسی کے

Scanned with CamScanner

ہوتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسے طریقوں سے تاریخی شخصیات کی اصل فطرت معلوم کر سکتے ہیں۔ شاید ان کی زندگیوں میں ایسی چیزیں ہوں جو دستاویزات اور کتبوں میں نہ آتی ہوں۔ میری رائے یہ ہے کہ ہمیں ان دوسری اشیا پر اپنی توجہ مرتکز کرنی چاہیے جو ان کہی کے اندھیروں میں پوشیدہ ہیں۔ اس یقین کے ساتھ میں نے مہاراجا چندرگپت کی ایک نئی سوانح پر کام شروع کیا ہے۔ میں نے ان سب چیزوں کو نظرانداز کر دیا ہے جنھیں دلکش بھولپن کے ساتھ بنیادی ماخذات کہا جاتا ہے۔ میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو میرے سامنے سادے کاغذ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا، "میں بہت خلوص کے ساتھ اس تجربے میں تمھاری کامیابی کی امید کرتا ہوں۔ اگر تم جیسے نوجوان اس دلیرانہ جذبے کا مظاہرہ کرنے لگیں تو مجھے یقین ہے کہ تاریخ نویسی میں نشاۃ الثانیہ برپا ہو جائے گی۔ میں صرف یہ آرزو کر سکتا ہوں کہ میں چندرگپت پر تمھارے کام کے مکمل ہوجانے تک اس دنیا میں رہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کہیے،" سدانند نے جلدی سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ ابھی آپ بہت برسوں تک اور جئیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی آشیرواد سے میں اپنا منصوبہ پورا کر لوں گا اور اس مونوگراف کا آپ کے نام انتساب کروں گا۔"

مجھے تسلیم ہے کہ میں خاصا متاثر ہو گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میری زندگی کے ستر برس بیکار نہیں گئے۔

سدانند کرسی سے اٹھا اور طوطے کے پنجرے کے پاس چلا گیا۔ طوطے نے اسے آنکھ سے تاڑا اور پھر چلایا، "تاریخ ہمارے ساتھ ہے"۔ سدانند مڑا اور دروازے کے پاس والی کھڑکی کی طرف چلا۔ وہ باہر جھانکنے لگا۔ باہر سے اسٹیم رولر کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دے رہی تھی اور مزدوروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں سدانند کو دیکھ رہا تھا۔

پھر سدانند نے اپنا سامان کھولا۔ اس نے ایک بڑا ڈبا نکالا اور اسے میری میز پر رکھ دیا۔ "دیکھیے،" اس نے کہا۔ "ٹیپ ریکارڈر ہے۔" میں کچھ حیران سا ہو گیا۔ ایک معمولی اسکول ٹیچر بھلا ٹیپ ریکارڈر کہاں سے خرید سکتا ہے؟ سدانند کو شاید میرے خیالات کا اندازہ ہو گیا۔ "میں نے اپنی بچت کا زیادہ تر حصہ اس میں لگا دیا،" اس نے کہا۔ "میرے ذہن میں ایک اور منصوبہ بھی تشکیل پا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تاریخی مقامات کی خاموشی محفوظ کی جائے۔ مجھے خیال آیا کہ تاریخی مقامات کی لوگ صرف تصویریں لیتے ہیں۔ ہم صرف تصویروں سے کیا جان سکتے ہیں؟ سماجی حقیقت بھی اہم ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ مختلف تاریخی مقامات پر جاؤں اور وہاں کی خاموشی ریکارڈ کروں۔ ظاہر ہے کہ خاموشیاں پس منظر کے شور سے داغ دار ہیں۔ مثلاً لال قلعے کی میری ریکارڈنگ نے سیاحوں کے گائیڈ کا رواں تبصرہ پکڑ لیا۔ خوش قسمتی سے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جو ریکارڈنگ میں نے تاج محل کے سامنے کی، اس میں ایک بچے کے پانی میں پتھر پھینکنے کی آواز آ گئی۔ ممبئی کے پاس ایلیفنٹا کے غاروں میں ایک اکیلے بندر کی چیخ شامل ہو گئی۔ آپ آوازوں کو کتنا بھی باہر رکھنا چاہیں وہ

مداخلت کر جاتی ہیں۔ لیکن اگر آپ غور سے سنیں تو آوازوں کے پیچھے خاموشی سنائی دیتی ہے۔ میں کچھ زیادہ سفر نہیں کر سکتا۔ اسکول ٹیچر کی تنخواہ میں بھلا کہاں ممکن ہے؟ اب میں یہاں ہوں تو شہر سے باہر جو مغل مقبرہ ہے اس کی خاموشی ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر سدانند نے اپنے ٹیپ چلائے اور قدیم مقامات کی خاموشی نے مجھے اپنا حلقہ بگوش بنا لیا۔

دوپہر کے کھانے پر سدانند ان دنوں کو یاد کرتا رہا جو ہم نے ساتھ بتائے تھے، مگر میں نے غور کیا کہ وہ اپنی شادی کا ذکر کرنے سے پہلو بچا رہا ہے۔ مٹھائی کا جو ٹکڑا میں نے صبح کھایا تھا اس نے میری بھوک خراب کر دی تھی۔ میرا معدہ مٹھاس آسانی سے ہضم نہیں کر سکتا۔ میں نے بس ذرا سا کھایا، وہ بھی اس لیے کہ سدانند کا ساتھ دے سکوں۔

کھانے کے بعد سدانند اپنا ٹیپ ریکارڈر لے کر چلا گیا۔ میں قیلولے کے لیے لیٹ گیا، مگر سو نہ سکا۔ باہر دوپہر کے سنّاٹے میں گرجتے ہوئے اسٹیم رولر کی آواز سنتا رہا۔

ذرا دیر بعد مجھے فراغت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ خلاف معمول بات تھی، کیوں کہ میں اپنی عادات میں بیحد باقاعدہ ہوں۔ میرے پیٹ میں صبح کے سوا شاید ہی کبھی قراقر ہوتی ہو۔ مجھے خیال ہوا کہ صبح جو مٹھائی کھائی تھی وہی موجودہ صورت حال کی ذمےدار تھی۔ میرا جسم بہت عجلت کے ساتھ اس شے کو خارج کر دینا چاہتا تھا جو اس کے لیے ناخوشگوار تھی۔ مجھے خیال ہوا کہ اسے کھا کر میں نے غلطی کی۔ پھر بھی بہت زیادہ کوتاہی نہیں ہوئی؛ اطمینان سے فراغت پا لینے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔

میں بیت الخلا گیا۔ اندر گھستے ہی دیوار پر چھت کے پاس ایک چھپکلی دکھائی دی۔ میں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔

یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا کہ میں نے بیت الخلا کی دیوار پر چھپکلی دیکھی تھی۔ بیت الخلا کے اوپر چھوٹی سی دوچھتی ہے اور پیچھے کا روشن دان اس دوچھتی تک جاتا ہے۔ اس دوچھتی کی چھپکلیاں اکثر کیڑوں کی تلاش میں بیت الخلا میں گھس آتی ہیں۔ خاص طور پر رات کو۔

مجھے چھپکلیوں سے گھن آتی ہے اور انھیں مارنا آسان نہیں ہے۔ جھاڑو کا وار کوئی خاص کارگر نہیں ہوتا۔ اکثر چھپکلی کی صرف دُم آپ کے سامنے رہ جاتی ہے اور دیوانوں کی طرح پھڑکتی رہتی ہے۔

خاص طور پر مجھے جو گھن آتی ہے تو بیت الخلا میں چھپکلی کو دیکھ کر۔ میں نے ان کو نیست و نابود کرنے کا ایک طریقہ نکالا ہے۔ جھاڑو اٹھا کر میں دھیرے دھیرے چھپکلی کے جتنے پاس آ سکتا ہوں، آ جاتا ہوں۔ بہت ہوشیاری سے میں اس پر بجلی کا سا وار کرتا ہوں۔ عموماً وہ فرش پر گر پڑتی ہے، ایک لمحے کے لیے چکرائی ہوئی، مگر فوراً مرتی نہیں۔ میں جلدی سے اس کو فلش میں پھینک دیتا ہوں اور زنجیر کھینچ دیتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ چھپکلی کو کچھ پتا چلے وہ گٹر میں بہہ جاتی ہے۔ یہ حکمتِ عملی دو مقامات پر خاصی مہارت کا تقاضا کرتی ہے۔ پہلے تو جب چھپکلی فرش پر ٹپکے تو اسے فوراً بالکل ٹھیک ٹھیک فلش میں اچھالنا ہوتا ہے۔ اگر چوک جائیں تو وہ ہوش و حواس میں آ جائے گی اور، اس سے پہلے کہ آپ کو موقع ملے،

Scanned with CamScanner

تھا۔

پھر بھی میں اس حقیقت کو نہیں چھپا سکتا کہ اس وقت سدانند کی موجودگی سے میں لطف اندوز ہو رہا تھا۔ مزید براں، ماضی کی یاد سے مجھ میں ایک ہیجان برپا ہو رہا تھا۔ میں اس کیفیت میں بے چین سا تھا۔ لہٰذا میں نے سدانند کے سامنے تجویز رکھی کہ ہم "بھینڈی" کا کھیل کھیلیں۔ بچپن میں اس کھیل میں خاص طور پر بہت مزہ آیا کرتا تھا۔ ہم جگہوں کے ناموں سے کھیلا کرتے تھے، حالانکہ یہ کھیل اور دوسرے ناموں سے بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ اگر میں کہتا "احمدآباد" تو سدانند کو آخری حرف اٹھانا ہوتا اور کہنا ہوتا کہ مثلاً "دولت آباد"۔ پھر میں کوئی ایسا نام لیتا جیسے "ڈاکر" اور سدانند مجھے حیران کرنے کے لیے "ریو ڈی جنیرو" کہہ دیتا اور اس طرح سلسلہ چلتا رہتا۔ اس طرح بیسیوں جگہیں، چاہے وہ ایک دوسرے سے کتنی ہی دور کیوں نہ ہوں، آپس میں جڑ جاتی ہیں، ایک جال کی بُنت کی طرح، اور محض اسی حقیقت پر مبنی کہ ایک نام کا پہلا حرف اور کسی دوسرے نام کا آخری حرف ایک ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ جال دو ذہنوں کے اتحاد سے بُنا جاتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے دونوں یک جا ہو جائیں۔ اس میں آپس کا تصادم نہیں ہوتا، جس طرح شطرنج میں ہوتا ہے۔

آہستہ آہستہ ہم اس کھیل میں گرم جوش ہوتے گئے۔ پہلے تو میں مناسب نام جلدی جلدی نہیں سوچ سکا مگر پھر انہیں بہت تیزی سے اچھالنے لگا۔ ایک مقام پر سدانند کو اپنے ذہن پر بہت دیر تک زور ڈالنا پڑا۔

جب سدانند سوچ رہا تھا تو مجھے احساس ہوا کہ مجھے بیت الخلا کا ایک اور چکر لگانا پڑے گا۔ میں نے اس سے کہا کہ جتنا وقت چاہیے لگا لے، اور اپنے آپ کو یہ تسلی دیتا ہوا بیت الخلا گیا کہ اس مرتبہ میں یقیناً کامیاب ہو جاؤں گا۔ زندگی میں خوداعتمادی کی بہت اہمیت ہے۔

یہ ترکیب سودمند ثابت ہوئی۔ اس مرتبہ میں نے جلدی سے فلش میں جھانکا تاکہ صبح کی غفلت نہ دہرائی جائے۔ پاخانہ معمول کے مطابق رنگت اور ٹھوس پن کا نہیں تھا؛ نرم اور ہلکا پیلا نظر آ رہا تھا۔ مگر اس احساس سے کہ میرا پیٹ صاف ہو گیا ہے، مجھے تسکین ہو گئی۔ جب میں واپس آیا تو سدانند نے ایک جگہ کا نام سوچ نکالا تھا جس کا اس نے نہایت فتح مندی سے میرے سامنے اعلان کیا۔

جلد ہی ہم اس کھیل سے اُوب گئے۔ جب ناموں کا جال دور تک پھیلنے لگے تو آدمی یہ سوچتا ہے کہ اس میں کچھ پھنسے گا بھی۔ اور پھر اس بات سے فرق کیا پڑتا ہے کہ میں کہوں "احمدآباد" اور دوسرا آدمی کہے "دولت آباد"، یا اس کا الٹ؟

پھر میرا پیٹ ہولے ہولے غرّانے لگا اور ہم نے کھیل چھوڑ دیا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں نیچے سڑک بنانے والوں کو کام کرتا دیکھتے رہے۔ بجری اسفلٹ کے ساتھ ملائی جا رہی تھی؛ مزدور چیخ رہے تھے، اور اسٹیم رولر راکھشس کے دل کی دھڑکن کی طرح دنادن کر رہا تھا۔ اس طرح یہ لوگ وہ سڑکیں بناتے ہیں جن پر ہم سرگشت کرتے ہیں۔

مجھے مجبوراً بیت الخلا کا ایک چکر اور لگانا پڑا۔ اس بار میں نے دیکھا کہ چھپکلی پھر

بہاکر لے جائے۔ چھپکلی رینگ کر باہر نکل آئے گی۔ اگر سب ٹھیک ٹھاک کام ہو تو یہ چھپکلیوں سے نجات پانے کا نہایت موثر طریقہ ہے۔

اب میں ہاتھ میں جھاڑو لے کر چھپکلی کی طرف بڑھا۔ میں نے وار کیا، چھپکلی گری اور میں نے اسے جلدی سے فلش کی طرف اچھال دیا۔ مگر میرا نشانہ خطا ہو گیا اور چھپکلی فلش کے دوسری جانب گری۔ قبل اس کے کہ میں دوبارہ ماروں، وہ دیوار پر چڑھ گئی، روشن دان پر آئی اور دوچھتی میں غائب ہو گئی۔

میں نے جا کر جھاڑو واپس رکھ دی۔ اگر میں نے چھپکلی مار لی ہوتی تو میں ایک احساسِ تسکین کے ساتھ فارغ ہونے کو جا بیٹھتا۔ پھر بھی اب جانا مناسب تھا کیوں کہ اس کا امکان کم تھا کہ چھپکلی دوبارہ اترے۔ میں جا کر بیٹھ گیا مگر کچھ ہوا نہیں۔ میں جھنجھلا گیا، کیوں کہ ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ بہت سال پہلے مجھے بواسیر ہو گئی تھی، مگر مجھے قبض کی مصیبت کبھی نہیں جھیلنا پڑی۔ میں سوچنے لگا کہ مٹھائی جو میں نے کھائی تھی یہ سب اس کی وجہ سے ہو رہا تھا، یا چھپکلی کو ٹھکانے لگانے میں ناکامی کی وجہ سے مزاج میں جو برہمی پیدا ہو گئی تھی، اس سے یہ ہوا تھا۔ میں بیت الخلا سے باہر نکل آیا اور ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ سدانند اندر آیا۔ اس نے اپنا ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھا اور اعلان کیا "اس بار میں نے بھرپور خاموشی ریکارڈ کر لی ہے۔" اس نے ٹیپ چلایا۔ مجھے اس میں سے کسی جھینگر یا ٹڈے کی چرچراہٹ کی دھندلی مگر مسلسل آواز آ رہی تھی۔ "ارے! میں نے غور ہی نہیں کیا کہ جھینگر بول رہا ہے۔" سدانند نے کہا۔ اگر یہ بھری دوپہر میں چرچراتا ہے تو اسے رات کا کیڑا کیوں کہتے ہیں، میں سوچنے لگا۔

مجھے خیال آیا کہ سدانند کی واپسی سے میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں اتنے برسوں سے اکیلا رہ رہا تھا۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس بات سے میرا وہ مطلب نہیں ہے جو اس وقت مراد لیا جاتا ہے جب آپ کہتے ہیں کہ مثلاً آپ کو ایک نوکر کی ضرورت ہے۔ میرا مطلب اس ہولناک ضرورت سے ہے جس سے انسان جتنا دور رہے بہتر ہے۔ میں نے لوگوں کو اس ضرورت کے آسیب میں مبتلا دیکھا ہے، اور یہ بھی دیکھا ہے کہ وہ کن حالوں کو پہنچے۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی ایسی خواہش کے دام میں نہیں پھنسنے دیا۔ واقعی یہ بہت ستم ظریفی ہو گی، میں نے سوچا، کہ اگر اس آخر عمر میں یہ طلب مجھ پر شب خون مارے۔ میں نے اپنے آپ کو اس خیال سے تسلی دی کہ یہ ضرورت لمحاتی تھی۔ میں ستر برس کا تھا اور اتنی جاتی خواہشوں کی رو میں بہہ نہیں سکتا تھا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ سدانند زیادہ عرصے تو نہیں رہے گا، اور جب وہ چلا جائے گا تو میں پھر اپنی مطمئن زندگی پر چل پڑوں گا۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ آدمی کو ضرورت محسوس ہو اور وہ پھر اسے پورا کرنے کی کوشش کرے، مگر اکثر آپ بیٹھے بٹھائے کسی کی ڈَسراہٹ اختیار کر لیتے ہیں اور اس سے ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ آدمی کو ایسے پُرفریب خطرات سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ مگر اب میرے ساتھ ایسا ہونے کا امکان کم ہے۔

Scanned with CamScanner

دیا۔ اپنی اس کارگذاری نے مجھے مسرور کر دیا۔

پاخانہ پچھلی مرتبہ کا جیسا تھا۔

سدانند نے پوچھا کہ میرا معدہ تو خراب نہیں۔ اس نے کہا کہ اس کے پاس گولیاں ہیں مگر میں نے سختی کے ساتھ انکار کر دیا۔ میں جس حد تک ممکن ہو دواؤں سے اجتناب برتتا ہوں۔ میں نے اپنی بےچینی پر پردہ ڈالنے کے لیے چہرے پر مطمئن تاثر طاری کر لیا، مگر سدانند اصلیت سے واقف نظر آ رہا تھا۔ اس نے میرا دھیان بٹانے کے لیے ایک چیز سوچی۔ اس نے طوطے کا پنجرہ اتارا، مجھ سے کہا کہ طوطے سے بولنے کو کہوں اور اپنا ریکارڈر کھول دیا۔ "تاریخ ہمارے ساتھ ہے"، طوطا چلایا۔ پھر سدانند نے طوطے کا پنجرہ آئینے کے سامنے رکھ دیا اور ٹیپ چلایا۔ "تاریخ ہمارے ساتھ ہے" ریکارڈر نے اعلان کیا۔ پنجرے کا طوطا آئینے میں اپنے عکس اور ریکارڈر کی آواز سے دھوکا کھا گیا۔ وہ سمجھا کہ اس کے سامنے ایک اور طوطا ہے۔ وہ چلانے لگا، پر پھڑپھڑانے اور تیلیوں سے دیوانہ وار ٹکرانے لگا۔

طوطے کی مشقت پر سدانند ہنسنے لگا۔ اس نے ٹیپ پھر چلائی اور طوطا سلاخوں سے اور جان توڑ کر سر مارنے لگا۔ سدانند مارے ہنسی کے لوٹ گیا۔ میں دیکھتا رہا۔ بس سدانند کی مسرت کی وجہ سے شاید میرے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی ہو، مگر درحقیقت مجھے بہت تشویش تھی۔ ایک تو میرے پیٹ کا بڑھتا ہوا درد مجھے بےکل کیے دے رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ میرا خیال تھا طوطے سے یوں شرارت کرنا کچھ ٹھیک نہیں۔ تاریخ کس کے ساتھ ہے؟ میں نے پنجرے میں بند اصلی طوطے اور منعکس پنجرے میں قید منعکس طوطے کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔

طوطے کی کشمکش نے مجھے بےچین کر دیا تھا۔ اب تک میرا طوطا آرام سے رہا کرتا تھا۔ صرف ایک دفعہ جب جنگلی طوطوں کی ایک ڈار میرے گھر پر سے پکارتی ہوئی گذری تو طوطا اپنے پنجرے میں ٹنگا ہوا بیٹھا سنتا رہا اور دیر تک کوئی حرکت نہ کی۔ اس کے علاوہ وہ ایک خوشگوار ساتھی تھا۔ اور اب اسے آئینے میں طوطے کو دیکھ دیکھ کر جان پر کھیل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ میرا چہرہ درد کی شدت سے بگڑنے لگا اور میں کبھی پنجرے میں طوطے کو، کبھی آئینے میں اس کے عکس کو، اور کبھی سدانند کو دیکھتا۔ باہر اسٹیم رولر گڑگڑ رہا تھا، بجری کو پیس کو خاک کر رہا تھا۔

پنجرے کی تیلیوں کے خلاف جدوجہد میں طوطے کے پر پھول گئے اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ تھکا ماندہ نظر آنے لگا۔ اس کی حرکات سست ہو گئیں اور اس کی چیخیں تیز تر۔ مگر وہ وقفے وقفے سے جدوجہد کرتا رہا، یہاں تک کہ اس سے بلا نہیں جا رہا تھا۔ پھر اچانک وہ چلایا، "تاریخ ہمارے ساتھ ہے"، اور پنجوں کی ایک تشنج زدہ حرکت کے ساتھ پنجرے کے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے کوئی حرکت کی اور نہ آواز نکالی۔ کچھ دیر تک سدانند کو احساس نہیں ہوا کہ کیا ہوگیا۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھتا رہا، جن میں ہنسی کے مارے آنسو آ گئے تھے، اور ہنستا رہا۔ پھر اس نے طوطے کی حالت دیکھی۔ وہ دم بخود

رہ گیا اور پنجرے کو گھورنے لگا۔ پھر وہ ٹھہرا ہو گیا اور بار بار پنجرے اور آئینے کو دیکھنے لگا۔

سدانند چلتا ہوا پنجرے کے پاس آیا اور چند لمحوں کے لیے اس کے سامنے کھڑا رہا۔ اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا، اسے انہماک سے دیکھتا رہا جیسے اسے امید ہو کہ طوطا کسی لمحے پھر سے اڑ جائے گا۔

ڈرتے ڈرتے سدانند نے اپنا ہاتھ پنجرے میں ڈالا اور انگلی طوطے میں بھونک کر دیکھی۔ طوطا ایک طرف کو ڈھلک گیا اور اس کے پنجے ہوا میں اٹھ گئے۔ سدانند نے ہاتھ اور اندر ڈالا اور اس کا جسم دبوچ لیا، اسے باہر نکالا، ہاتھ کھولا اور مردہ طوطے کو تکتا رہا۔ پھر، جیسے کسی چیز نے اسے ڈنک مار دیا ہو، اس نے طوطے کا جسم پنجرے میں ڈال دیا اور دروازہ جلدی سے بند کر دیا۔ وہ مڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ میں اس کی آنکھوں میں خوف اور ندامت کی تحریر پڑھ سکتا تھا۔

پیٹ کی اینٹھن سے میں کانپ رہا تھا اور صورت حال کو بد سے بدتر بنانے کے لیے، سدانند کی شرارت کی وجہ سے، میرا طوطا جس نے برسوں میرا ساتھ نبھایا وہ اب جا چکا تھا، اور جہاں تک سدانند کا تعلق تھا وہ بھی ایک آدھ دن میں چلا جائے گا۔

طوطے کے بغیر کام چلانا اتنا مشکل تھا؟

شاید بہتر ہوتا کہ میں نے طوطا پالا ہی نہ ہوتا۔

اگر میں نے طوطا نہ پالا ہوتا... اگر سدانند مجھ سے ملنے نہ آیا ہوتا... میرا دماغ چکرانے لگا۔ اچانک میں سدانند کے خلاف غصے سے کھولنے لگا۔ اس نے میرے طوطے کو مار ڈالا تھا۔ اس نے مجھے منہائی کھلائی تھی اور اس مصیبت کا سبب بنا تھا۔ شاید اس نے منہائی میں کوئی چیز ملا دی ہو؟ شاید کوئی زہر؟ کیا وہ اتنی دور صرف مجھے مبارک باد دینے آیا تھا؟ نہیں، اس نے میرا کام تمام کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ میری کتاب سے جلتا تھا، میری عالمانہ وقف علم زندگی سے جلتا تھا۔ اس نے مجھے چاپلوسی کے ذریعے دھوکا دیا۔

میرا چہرہ درد کی شدت سے بگڑ کر اور ٹیڑھا ہو گیا اور ایک ایسی آواز میں جس کی کرختگی نے خود مجھے حیران کر دیا، میں نے سدانند کو حکم دیا کہ آئینے کے سامنے بیٹھ جائے۔ سدانند نے بات مان لی اور میں نے ٹیپ ریکارڈر کھول دیا۔ "بولو!" میں نے کہا۔

سدانند بولا، "اکیلا آدمی اپنے جوتے گھس دیتا ہے۔ غیر بالآخر آدمی کو بےخبری میں آ لیتا ہے۔ ایک نہ ایک دن، ہاتھ میں پستول پکڑے۔ کس کے قدموں کے نشان الٹے پڑے ہیں؟"

میں نے ٹیپ ری وائنڈ کیا، "آئینے میں دیکھو۔" میں نے سدانند سے کہا، اور ٹیپ چلایا۔ سدانند اپنے عکس کو تکتا رہا اور اپنے الفاظ سنتا رہا۔ میں نے ٹیپ پھر ری وائنڈ کیا اور پھر چلایا، اور ایک بار پھر۔

میں سدانند کو دیکھتا رہا۔ اس نے طوطے کی طرح جدوجہد نہیں کی۔ وہ بےحس و حرکت بیٹھا آنکھیں پھاڑے آئینے میں جھانکتا رہا اور اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرنے لگیں۔ ذرا دیر بعد اس کا سارا جسم پسیجنے لگا۔ پھر وہ بہت آہستہ سے اٹھا اور قدم ناپ ناپ کر الٹا

Scanned with CamScanner

بیٹھے کوئی نیند میں چل رہا ہو۔ مجھے لگا کہ وہ اپنے پیچھے کی دیوار سے ٹکرا جائے گا مگر جوں ہی وہ دیوار تک پہنچا اس کی ٹانگیں جواب دے گئیں اور وہ فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی انگلیاں پھڑکتی رہیں جیسے وہ کسی چیز کو تھام لینا چاہ رہی ہوں۔ پھر وہ ساکت ہو گیا۔ میں اٹھا اور بھاگا بھاگا بیت الخلا گیا۔ واپس آ کر میں بہت کمزوری محسوس کرنے لگا۔ میرے معدے میں مروڑ ہوئے جا رہا تھا۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔

میں سدانند کے جسم کے پاس آیا اور نیچے جھک کر اس کا ماتھا چھوا، ٹھنڈا، جیسے سنگ مرمر۔ میں نے اس کا ہاتھ اٹھایا اور نبض ٹٹولنے لگا۔ نبض کا کوئی پتا نشاں نہیں تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ پھر میں مڑا اور کھڑکی کے پاس چلا آیا۔ شام ہو گئی تھی اور اندھیرا ہو رہا تھا۔ مزدور گھروں کو جا چکے تھے۔ اسٹیم رولر سڑک کے کنارے سوئے دیو کی طرح پڑا ہوا تھا۔

آرام کرسی میں ڈھیر ہو کر میں سدانند کے جسم کو دیکھتا رہا۔ میرے پیٹ کا درد کم ہونے میں نہ آتا تھا۔ میں اٹھا اور الماری سے سفوف کی وہ شیشی نکالی جو برسوں پہلے مجھے جھمیکر شاستری نے دی تھی۔ میں نے پانی کے ساتھ چمچا بھر سفوف حلق سے اتارا اور بستر میں لیٹ گیا۔ پھر مجھے دوبارہ بیت الخلا جانا پڑا۔ گرتا پڑتا ہوا میں بمشکل تمام بستر سے فلش تک پہنچ پایا۔ ذرا دیر ہوتی تو میرا جانگھیا سن گیا ہوتا۔ پاخانہ پتلا تھا۔ میں وہیں بیٹھا رہا کہ شاید میری آنتوں کو اور خارج کرنا ہو۔ میں چاہتا تھا کہ ایک مرتبہ پوری طرح جلاب ہو جائے، اور مجھے کوئی خواہش نہ تھی کہ بیت الخلا جانے کا یہ عمل بار بار دہرانے جاؤں۔

فلش پر اکڑوں بیٹھے بیٹھے مجھے دھیان ہوا کہ میں بغیر کسی خاص وجہ کے اس چھپکلی کے بارے میں سوچ رہا ہوں جس کا میں نے کام تمام کر دیا تھا۔ میں یہ تصور کرنا چاہ رہا تھا کہ فلش میں اچھلتے پانی میں چھپکلی کس طرح مرتی ہے۔ کیا چھپکلی واقعی مر جاتی ہے؟ میں نے اپنےآپ سے سوال کیا۔ میرے دماغ کے بھنور میں یہ سوال بغیر کسی جواب کے منڈلاتا رہا۔ پھر مجھے ایک عجیب احساس ہوا۔ جسم اور ذہن میں غضب ڈھاتے خیالات، جذبات اور احساسات کے ہجوم میں مجھے پہلے پہل اس احساس کا پوری طرح ادراک بھی نہیں ہوا۔ مگر پھر یہ بڑھنے لگا۔ تب مجھے لگا کہ یہ چھپکلی کی طرح محسوس ہو رہا ہے جو بیت الخلا کے فلش سے نکل آئی ہو اور میرے اندر گھس رہی ہو۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اس کیفیت کو دبا لوں، اور اپنے آپ کو باور کرانے کی کوشش کی کہ یہ چیز ناممکن ہے۔ مگر میری کوشش بےکار رہی۔ مجھے زیادہ سے زیادہ شدّت سے احساس ہو رہا تھا کہ چھپکلی کلبلاتی ہوئی اوپر جا رہی ہے۔

چکرایا ہوا میں بیت الخلا سے باہر نکلا اور اپنے آپ کو بستر پر گرا دیا۔ میں چھت کو تکتا رہا۔ پھر میں اٹھا اور بہت مشکل سے چلتا ہوا سدانند کے جسم کے پاس آیا۔ میں نے جھک کر اس کو اٹھانے کی کوشش کی مگر کچھ بن نہ پڑا۔ کسی نہ کسی طرح میں اس کو پلنگ تک گھسیٹ لایا اور اسے اوپر لاد دیا۔ میں نے اسے دیوار کی طرف کروٹ دلا دی۔ میرا سانس بری طرح پھول گیا۔ میں نے اپنے آپ کو تھکا ڈالا تھا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ میری موجودہ حالت میں

یہ کسی طرح مناسب نہیں تھا۔ غالباً اس عمل کی تکان سے از سرنو فارغ ہونے کا زور اٹھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ جاؤں اور فلش پر اکڑوں بیٹھوں مگر اپنے آپ کو تسلی دے کر کہ یہ آخری دفعہ ہے، میں بیت الخلا تک گیا۔

کچھ نہیں ہوا۔ میں بےکار بیٹھا رہا۔ اور پھر جیسا کہ مجھے توقع تھی، وہ احساس جو مجھے پہلے ہوا تھا، پھر اٹھا۔ میں نے اس بیت الخلا میں اَن گنت چھپکلیاں ماری تھیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں جوش و خروش کے لیے ان چھوٹے موٹے مواقع کا عادی ہو گیا تھا اور اب یہ ساری چھپکلیاں فلش میں رینگ رہی تھیں اور مجھ پر یورش کرنے کے لیے دھکم پیل کر رہی تھیں۔ میرا سارا بدن کانپ اٹھا۔

ذرا دیر بعد میرے لیے اکڑوں بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ کھڑے ہونا بھی اتنا ہی مشکل نظر آ رہا تھا، مگر دیوار کا سہارا لے کر میں بڑی دقّت سے اٹھا، خواب گاہ تک لڑکھڑاتا ہوا آیا اور لوٹ ہو کر پلنگ پر گر گیا۔ میرے پیٹ میں ایک ایک کر کے پھسلتی چھپکلیوں کا احساس ناقابلِ برداشت حد تک شدید ہو گیا۔ میں بستر پر سر پٹخنے لگا۔

میں نے سوچا کہ سدانند کے ساتھ جو کچھ کیا وہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اس وقت میری مدد کرتا۔ سدانند اچھا آدمی تھا۔ وہ میری مدد کرتا اور میری دیکھ بھال کرتا۔ اور میں نے اپنے ذہن میں اس کے بارے میں کس قدر بھیانک خیالات کو جگہ دی تھی! وہ طوطے سے صرف میری دلچسپی کی خاطر کھیل رہا تھا۔ وہ اتنی دور سے مجھے مبارک باد دینے آیا تھا، اور میں نے اس کی نیت پر شبہ کیا۔ اب اس کا کچھ باقی بچ رہا تھا تو میرے برابر ٹھنڈا پڑا ہوا یہ بدن۔ ذہن میں برپا شورش لیے میں نے بازو پھیلایا اور سدانند کا چہرہ چھوا۔ دھیرے دھیرے میں نے اس کے چہرے پر اور اس کے سینے پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رہنے دیا۔ میں بڑا مشکل سے اپنی ٹانگوں کے بیچ میں بھنجتی پھنستی مخلوق کو برداشت کر رہا تھا مگر میں نے اپنی رانیں سکیڑ لیں۔

رات کو دیرگئے مجھے لگا کہ میں نے بارش کی آواز سنی۔ پھر خاک آلود زمین پر برسات کی پہلی بارش برسنے کی مخصوص خوش بو آئی۔ ہر چیز اپنی ہی دھارے کی شکلیں بنا رہی تھی کہ مجھے نیند آ گئی۔

(مراٹھی)
انگریزی سے ترجمہ : آصف فرخی
(بہ شکریہ "ادبِ لطیف" لاہور)

Scanned with CamScanner

بخدمت جناب مدیر صاحب ٹائمز آف انڈیا

جناب عالی!

کیا پڑھے لکھے گھر کے حکام کو علم ہے کہ بعض اوقات [illegible] کیا ہے اور کیا پڑھتے جانوروں کو کس طرح تنگ کرتے ہیں؟ میں نے ابھی [illegible] کے بڑے گھروں میں بچے [illegible] اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی ہندوستانی خصوصیت ہے۔ بدقسمتی سے ہم اس کو [illegible] نہیں کر سکتے۔ والدین اور اسکولوں کو چاہیے کہ بچوں کو جانوروں سے ہمدردی [illegible] میں حقیقی دلچسپی پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس دوران میں بڑے گھر کے حکام کو چاہیے کہ [illegible] نگرانی کریں۔

(مس) [illegible]

بمبئی 23 ستمبر

میرے ابّا کو خرگوش ناپسند تھا۔ وہ اپنی آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے، اور خرگوش ان کے کمرے میں کودتا پھاندتا آ جاتا، تو وہ دستی پنکھے کی ڈنڈی سے فرش پر کھٹ کھٹ کر کے اسے ڈرا بھگاتے؛ اور جب خرگوش اپنے کان کھڑے کر کے دوسرے کمرے میں بھاگ جاتا تو وہ آرام کرسی میں ڈھیر جاتے اور پنکھا جھلنے لگتے۔ کرسی کی پشت کی نیلی اور ہری دھاری دار ترپال میں اتنا گہرا خم پڑ گیا تھا کہ ابّا اس سے ٹیک لگائے اس جہاز کی طرح نظر آتے جو سمندر کی تہ میں بیٹھ گیا ہو۔

جب میں پہلی دفعہ خرگوش گھر لے کر آیا تو سب نے اس کا سواگت کیا۔ برف سا اُجلا تھا وہ، اور آنکھیں لال موتیوں جیسی۔ اس کے کان اندر سے گلابی تھے۔ رنگ اتنا سفید تھا کہ ہمارے فلیٹ میں گھومتا گھامتا بہت بےتکا لگتا۔ کبھی وہ فرش پر چپکا بیٹھا ہوتا تو کھڑکی سے جھانکتا شام کا سورج اس پر آ کر ٹھہر جاتا اور اس کی پوستیں روشنی میں جھلملانے لگتیں۔

ظاہر ہے کہ خرگوش کو ہمیشہ اندر رکھا جاتا اور فلیٹ کا دروازہ مضبوطی سے بند رہتا کہ وہ باہر نہ جانے پائے۔ رات کو میں کھڑکیاں بھی بند کر دیتا کہ بلی نہ گھس آئے۔ دن بھر خرگوش ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں ٹہلتا پھرتا۔ جو پتّے ہم ڈال دیتے کھا لیتا، پانی پیتا، پھر ایک دم سے گھنٹوں کے لیے سمادھی جیسی کیفیت میں گم ہو جاتا۔ وہ میرے سونے کے کمرے میں ایک مخصوص کونے میں پیشاب کرنے آتا، اور جب وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں پھدکتا جاتا تب بھی کوئی آواز نہ آتی۔ لیکن اس کی ایک عجیب عادت تھی؛ اگر آپ کسی کمرے میں کھڑے ہوں تو وہ کہیں نہ کہیں سے برآمد ہو کر کودتا پھاندتا آتا اور آپ کے گرد گول گول گھومنے لگتا۔ شروع میں بڑا دل چسپ معلوم ہوتا؛ حیرت ہوتی کہ یہ کیوں کر رہا ہے۔ لیکن ذرا دیر کے بعد جب وہ آپ کے گرد کئی دفعہ چکر لگا چکا ہوتا، اور وہ بھی بالکل خاموشی سے، تو

آپ کو سر چکرانے سی ہونے لگتی۔ وہ آپ کے گرد یوں گھوم رہا ہوتا جیسے وہ گردباد میں پھنسا ہو اور آپ طوفان کی آنکھ؛ آپ اس کی احمقانہ حرکت پر چڑنے لگتے۔ آپ کو پتا نہ لگتا کہ کیا ہو رہا ہے، اور غصہ آنے لگتا۔ اور اگر آپ دھیرے سے اس کے کان پر ٹھوکر لگاتے تو وہ لمحہ بھر کو اپنے راستے میں بالکل ساکت ہو جاتا، جیسے مبہوت ہو گیا ہو۔ اور پھر دوبارہ آپ کے گرد چکر لگانے لگتا، اور آپ کی سمجھ میں نہ آتا کہ ہنسیں یا روئیں۔ پھر آپ کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ نہ رہتا کہ اس نے آپ کے گرد جو دائرہ بنایا تھا اس سے چھلانگ لگا کر باہر نکلیں اور دائرہ توڑ دیں۔ وہ ہکّابکّا رہ جاتا؛ آپ اس کے لیے گم ہو جاتے۔ پھر وہ کودتا پھاندتا ہوا، اور شاید تھوڑا سا دل برداشتہ بھی، وہاں سے چلا جاتا۔

بعض اوقات خرگوش بالکل ساکت بیٹھ جاتا۔ آنکھیں کبھی کھلی ہوتیں، کبھی بند۔ اگر کوئی اس کے پاس ذرا سی بھی آواز کرتا تو اس کے لمبے کانوں میں سے ایک جھک جاتا، پھر سیدھا ہوتا۔ خرگوش خود تو اس طرح چپکا بیٹھا رہتا، اس کے کان اینٹینا کی طرح حرکت کرنے لگتے۔ اور اگر آواز ایسی ہوتی کہ اسے کچھ شک ہو جائے تو وہ فوراً چوکنّا ہو جاتا۔ عجیب بات یہ تھی کہ بعض آوازیں، مثلاً سڑک پر گاڑی کی آواز، اس پر قطعاً اثرانداز نہیں ہوتی تھیں۔ لیکن اگر آپ اس کے کانوں کے پاس گھنٹی بجاتیں تو وہ اُچھل پڑتا اور کوشش کرتا کہ کھسک جائے، مگر فرش کے چکنے ٹائلوں کی وجہ سے ایسا کر نہیں پاتا تھا۔ اس کے ناخن فرش پر پھسلے جاتے اور جلد ہی اس کی حالت قابلِ رحم ہو جاتی؛ ٹانگیں تو عالمِ اضطراب میں چل رہی ہیں اور وہ اسی جگہ کھڑے کا کھڑا ہے۔ اس وقت وہ دیکھنے میں بڑا مضحکہ خیز معلوم ہوتا؛ اور پھر یہ کہ تمام آوازوں میں بھلا گھنٹی کی آواز اسے اس قدر کیوں ڈراتی تھی، یہ میں کبھی سمجھ نہ پایا۔

بعد میں خرگوش نے بعض غیرصحت مندانہ اطوار اپنا لیے۔ وہ ہر طرح کی چیزیں کھانے لگا۔ کبھی وہ چپل چاب جاتا، کبھی اخبار۔ ابّا اپنی چپلیں جوتوں کے ریک میں اوپر والے شیلف پر رکھنے لگے، اور ٹائمز آف انڈیا بھی چھپایا جانے لگا۔ اس کے بعد خرگوش کا رُواں اترنے لگا۔ اگر کوئی اس کے چٹکی لیتا تو انگلیوں کے درمیان بالوں کے گچھے اتر آتے۔ وہ بھوت لگنے لگا۔ اس وقت گھر میں کوئی بھی صحیح معنوں میں اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔ تو ایک دن میں نے اسے اٹھایا اور بمبئی کے چڑیا گھر وکٹوریہ گارڈنز کو دے ڈالا۔ جلد ہی ہم لوگ بمبئی چھوڑ گئے۔

اخبار میز پر ڈالتے ہوئے میں کرسی سے اٹھا، کھڑکی سے باہر جھانکا اور جمائی لینے لگا۔ پھر باہر کے خاک آلود منظر کو تکنے لگا۔ خاک میں اٹے درختوں پر دھوپ پھیلی تھی، اور پتّوں کی رنگت کیچڑ جیسی ہو رہی تھی۔

میں تمام دن اخبار پڑھتا رہا تھا، اس لیے میری آنکھیں تھک گئی تھیں اور بدن اکڑ رہا تھا۔ مجھے اصل میں اخبار پڑھنے کا کوئی خاص شوق نہیں ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب

Scanned with CamScanner

اخباروں کا ڈھیر لگا کر بیٹھ جاتا ہوں۔ اور نہایت دقّتِ نظر سے ان کا مطالعہ کرتا ہوں۔ خبریں پڑھتا ہوں۔ اشتہار دیکھتا ہوں۔ ہر چیز پر نظر ڈالتا ہوں۔ ایسا کرنے سے میں بہتر محسوس کرتا ہوں۔ جیسے میں بھی اسی دنیا کا حصہ ہوں۔

میری ایک عادت یہ ہے کہ جو چیز میری توجہ اپنی جانب مبذول کر لیتی ہے اسے کاٹ کر رکھ لیتا ہوں ... میرے پاس بہت سے ایسے تراشے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امّی اسے پسند نہیں کرتیں۔ اس لیے کہ جو آدمی ہم سے پرانے اخبار خریدتا ہے وہ ان اخباروں کے پیسے نہیں دیتا جن میں سے کچھ کاٹا جا چکا ہو۔

واقعی۔ ایسی دنیا کا تصوّر کریں جس میں اخبار نہ ہوں ... ان کے بغیر بھلا ہم کیا کریں گے؟ مگر آدم زاد بہت ہوشیار ہوتا ہے۔ وہ اخبار چھاپتا ہے۔ فلمیں بناتا ہے۔ تقریریں کرتا ہے۔ ان کو سنتا ہے۔ ثقافتی پروگرام کرتا ہے۔ اور جانے کیا کیا۔ اسی لیے ہم میں سے بہت کم لوگ پاگل ہوتے ہیں۔ جب میں بچّہ تھا تو مجھے مستقل ڈر رہتا تھا کہ میں بڑا ہو کر پاگل ہو جاؤں گا۔ (میرے بچپن کا دوسرا خوف یہ تھا کہ میں پیدائشی نامرد ہوں ... مگر یہ دوسری کہانی ہے۔) پاگل ہو جانے کا یہ خیال ہی اب مجھے تھوڑا سا پاگل پن لگتا ہے۔

میں کھڑکی کی سلاخوں پر کہنیاں ٹکائے کھڑا تھا۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی تھی۔ نومبر ختم ہو رہا تھا۔ جلد ہی سردیاں آ جائیں گی؛ چمکیلا آسمان نیلا پڑ جائے گا اور اتنا صیقل کیا ہوا لگے گا کہ بس اس پر کھرینچ پڑ جانے کی فکر ہونے لگے۔ سلاخوں پر کہنیاں ٹکائے میں باہر لگے پام کو دیکھتا رہا۔

میں نے پیچھے ایک آواز سنی مگر میں مڑنا نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے ابا حسبِ معمول کھنکھارے، جیسے شکایت کر رہے ہوں۔ اور میں نے سنا کہ وہ تمام اخبار اٹھا رہے ہیں جو میں نے میز پر ڈال دیے تھے۔ انھوں نے تمام صفحات احتیاط سے ترتیب میں رکھے، ہلکے سے ان کو میز پر کھٹ کھٹایا کہ کنارے برابر ہو جائیں۔ پھر دوہرا موڑ کے میز کے نیچے شیلف میں ٹھونس دیا۔ میں نے میز سے اخباروں کے ٹکرانے کی کھوکھلی آواز سنی اور میرا جی بیٹھ گیا۔ مجھے بہت کمزوری محسوس ہونے لگی۔ میں نے سلاخیں تھام لیں۔ ابا آہستہ سے اندر والے کمرے میں چلے گئے۔ ذرا دیر میں میری انگلیاں ڈھیلی پڑ گئیں۔ مگر مجھے لگا کہ دن بھر کا مطالعہ ضائع گیا۔

OOOOO

نیویارک، 15 اکتوبر: اسرائیل اور متحدہ عرب جمہوریہ کے وزرائے خارجہ سفارت کاروں کے اس بڑے اجتماع میں شامل تھے جس نے کل رات بھارتی وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے اعزاز میں دیے جانے والے استقبالیے میں شرکت کی۔
مبصرین نے بیان کیا کہ شریمتی گاندھی نے عرب اور اسرائیلی نمائندوں کو ایک

نئی تقریب میں جمع کر کے ایک اہم سفارتی کارنامہ انجام دیا ہے۔ عرب سفارت کار عموماً ایسی تقریبات کے دعوت نامے مسترد کر دیتے ہیں جن میں اسرائیلیوں کو بھی دعوت دی گئی ہو۔

سڈنی، ۳ نومبر: ہر چیز، جس میں مرغیوں سے لے کر پائنداز اور صابن شامل ہیں، اس وقت آسٹریلیا کے مقامی چوہوں کی افواج نے تصرّف میں لانا شروع کر دی ہے جبکہ وہ ملک بھر میں گشت کرتے کرتے خوردنی اشیا کی تلاش میں جنوب کا رخ کر رہے ہیں۔

بمبئی، 3 اکتوبر: جمعہ کے روز بمبئی کے زیادہ تر لوگوں کو "اتحاد" کے جلسوں میں پرانی قومی یکجہتی اور قومی اتحاد سے نجات پا کر اس روز مہاتما گاندھی کا جشن منانا تھا۔
سوائے دو ایک اجتماعات کے، اتحادی جلسوں میں تقسیم شدہ حلف نہ اٹھایا جا سکا کیوں کہ حلف نامے کا متن نئی دہلی سے تقسیم کے بعد آتی دیر میں موصول ہوا کہ جلسوں میں فراہم نہ کیا جا سکا۔ تاہم یکجہتی اور اتحاد کا حلف 9 اکتوبر تک کسی دن بھی اٹھایا جا سکتا ہے۔

چوہے، جو ایک ایک فٹ لمبے ہیں اور ان کے جسم بالوں سے ڈھکے ہوئے ہیں، کھانے کی تلاش میں دروازے اور ٹین تک کتر ڈالتے ہیں۔ واحد چیز جو ان کو روک سکی ہے وہ ہے کنکریٹ۔

لندن، 13 اکتوبر: کل یہاں سونے کی عالمی منڈیوں میں سونے کے بھاؤ اس وقت زیرِ و زبر ہونے لگے جب ڈیلر واشنگٹن میں ہونے والے بین الاقوامی مالیاتی فنڈ کے اجلاس میں سونے کی فروخت کی پالیسی پر گفتگو کے نتیجے کا انتظار کر رہے تھے۔
لندن میں یہاں بعض ڈیلروں کا خیال تھا کہ کئی ملکوں کے درمیان سونے کی فروخت کا معاہدہ یقینی ہے۔ صبح کے بھاؤ 39,00 ڈالر فی اونس پر رک گئے اور دوپہر کے بھاؤ 39,17 پر رکے۔

بتایا گیا ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں چوہے شمالی علاقے سے کوئینزلینڈ کی ملحقہ سرحد پر واقع بارکلے ٹیبل لینڈ کو ڈھانکے ہوئے ہیں "جیسے کوئی بہت بڑا سرمئی کمبل ہو"۔

سائیگون، 24 ستمبر: صدارتی مہیش یوگی کے مطابق ہیلنگز ابھی یوگا کے لیے ذہنی تیار نہیں ہیں۔ وہ کل رات نیویارک سے یہاں پہنچے۔

Scanned with CamScanner

کے لیے کہیں تیار نہیں ہے۔ ... میں ہمیشہ مہربان رہتی ہوں۔ اگر وہ کل بھی میرے پاس واپس آ جائیں تو مجھے خوشی نہیں ہوگی۔ اے پی

"بلیاں ان کے مقابلے پر نہیں آ رہی ہیں۔ کتے بھی ان سے گھبرا جاتے ہیں"۔ ایون ڈاؤنز اسٹیشن پر ایک کارکن نے کہا۔ "اب وہ مویشیوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں ... ان کے کھروں کی طرف سے کھانا شروع کرتے ہیں اور انہیں لنگڑا کر دیتے ہیں"۔

ماسکو، ۲۸ اکتوبر، سوویت حکومت نے چینی حکومت کو عوامی جمہوریہ چین کے قیام کی چالیسویں سالگرہ پر مبارک باد کا پیغام بھیجا ہے۔ جس نے پارٹی کا ذکر کر کے تمام روایتوں کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اس پیغام میں جو کل بھیجا گیا صرف چینی عوام اور روسی عوام کا ذکر تھا۔

چوہوں نے گھروں کے باغ غارت کر دیے، چھال والے درخت تباہ کر دیے اور راتوں کو گلے بانوں اور مویشی فارمز کے نگہبانوں پر ان کی گھریوں میں بھی حملے کیے۔

دہلی کی سٹی ۲۵ اکتوبر، ... نے آج ... کے درمیان وسیع موضوعات پر مذاکرے کی دعوت دی اور ساتھ ہی ... کو جو اس مذاکرے کو سیاسی اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہیں گے، اس میں شامل نہیں کیا جائے گا۔
۱۲ صفحات پر مشتمل یہ دستاویز، جو مجوزہ مذاکرے کے بارے میں ... کے خیالات پر مبنی ہے، ... کے سیکریٹریٹ نے آج عوام کے سامنے پیش کی۔ یہ دستاویز چیئرمین ... نے آج سے تین سال قبل ... کیا تھا۔
دستاویز نے زور دیا کہ یہ مذاکرہ "انسانی عقل کی دسترس میں آنے والے تمام موضوعات" پر ہو جیسے فلسفہ، مذہب، سیاست، اخلاقیات، معاشیات، عمرانیات، فنون اور حیوانات وغیرہ۔

ایون ڈاؤنز کے اسٹیشن پر اسکول میں انگریزی کی استانی مس جے انگسٹر نے کہا: "یہ بہت بھیانک ہے۔ میں نے ایسی کسی چیز کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا"۔

"چوہے ہر چیز میں گھس گئے ہیں۔ ایک رات میں نے سینڈلوں کا ایک جوڑا، تین جوڑی جوتے اور ایک جوڑا تسموں کا دھونے اور سوکھنے کے لیے باہر رکھ دیے۔ اگلی صبح میرے پاس صرف ایک سینڈل رہ گئی تھی۔"

کوپن ہیگن، ۱۵ اکتوبر، ڈنمارک کے ایوان نمائندگان کے سامنے ایک بل پیش کیا جا رہا ہے جو کثیر الازدواج شادیوں، بہن بھائیوں کے درمیان شادی اور ہم جنسی شادیوں کو قانونی حیثیت دینے کی سفارش کرے گا۔
یہ بل جو شادی کے عام طور سے تسلیم شدہ مفہوم کو یکسر ختم کر دے گا، سوشلسٹ عوامی پارٹی کا انتہا پسند دایاں بازو پیش کر رہا ہے۔
سیاسی ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسا قانون بننے کا کوئی امکان نہیں۔ یو پی آئی۔

جب کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں بچتی تو چوہے ایک دوسرے کو کھا لیتے ہیں۔ شمالی علاقے کے بعض حصوں میں ایسا بھی ہو رہا ہے۔ اے اے پی ایس۔

شکر ہے آسٹریلیا جزیرہ ہے۔

(مراسلہ)
انگریزی سے ترجمہ: آصف فرخی

کوپن ہیگن، ۱۵ اکتوبر، ڈنمارک کے ایوان خانہ گان کے سامنے ایک بل پیش کیا جا رہا ہے جو کثیر الازدواج شادیوں، ہم جنس جاتیوں کے درمیان شادی اور ہم جنسی شادیوں کو قانونی حیثیت دینے کی سفارش کرے گا۔

یہ بل جو شادی کے عام طور سے تسلیم شدہ مفہوم کو یکسر ختم کر دے گا، سوشلسٹ عوامی پارٹی کا انتہا پسند دایاں بازو پیش کر رہا ہے۔

سیاسی ماہرین کا کہنا ہے کہ ایسا قانون بننے کا کوئی امکان نہیں۔ یو پی آئی۔

جب کھانے کے لیے کوئی چیز نہیں بچتی تو چوہے ایک دوسرے کو کھا لیتے ہیں۔ شمالی علاقے کے بعض حصوں میں ایسا بھی ہو رہا ہے۔ اے اے ایں ایس۔

oooo

شکر ہے آسٹریلیا جزیرہ ہے۔

(مرانھی)
انگریزی سے ترجمہ : آصف فرخی

Scanned with CamScanner